کفار ومشرکین شیعہ غیر مقلدین مغرب زدہ مسلمان اور جاہل طبقہ کے اسلام پر اعتراضات وشبہات پر عقلی ونقلی جامع دلچسپ

جوابات

مسمیٰ بہ

اشرف الجواب

اردو عکسی مکمل

منتخب از خطبات

تالیف

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی قدس سرہ

اضافات

حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین صاحب مفتی دار العلوم دیوبند

باھتمام

وقار علی ابن مختار علی

ناشر

مکتبہ تھانوی دیوبند ضلع سہارنپور

اشرف الجواب

اردو عکسی مکمل

تصنیف — حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانوی رح

اضافات — حضرت مولانا مفتی ظفیر الدین مفتی دارالعلوم دیوبند

طابع — وقار علی ابن مختار علی

مطبع — تھانوی آفسیٹ پرنٹرس

ناشر — مکتبہ تھانوی دیوبند ضلع سہارنپور

کاتب — قمر الدین اعظمی

صفحات — ۶۲۴

سن طباعت عکسی ایڈیشن — اپریل ۱۹۹۰ء

ناشر

مکتبہ تھانوی دیوبند یوپی

اسلام پر کیئے گئے شبہات واعتراضات کے مدلل ومکمل جوابات

عقل ونقل کی روشنی میں

از :- محمد ظفیر الدین مفتی دار العلوم دیوبند

دار العلوم دیوبند انگریزی دورِ حکومت کا سب سے پہلا اسلامی مدرسہ ہے، جو حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی تحریک اور حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کے مشورہ اور مقامی علماء کے تعاون سے قائم ہوا، اس نے اپنی بے سروسامانی کے باوجود برصغیر میں جو تعلیمی اور علمی ودینی انجام دی، وہ ہندستان کی تاریخ کا نمایاں باب ہے، یہاں سے ہزاروں علماء وصلحاء اور اولیاء اللہ پیدا ہوئے، جنھوں نے ملک وملت کی بیش بہا خدمات انجام دی، اور ان کے فیوض وبرکات سے لاکھوں مسلمانوں نے ایمان و ایقان کی لذت پائی، اور تعلیمات نبوی کی اشاعت وترویج میں امتیازی رول ادا کیا، اور آج بھی دار العلوم دیوبند اپنی اسی پرانی شاہراہ پر گامزن ہے۔ اور کتاب وسنت کی تعلیم میں مشغول ہے۔

ممتاز فرزندانِ دار العلوم دیوبند کے انہی گنے چنے علماء میں حکیم الامت مجدد الملۃ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ذاتِ اقدس بھی ہے، جو بلاشبہ اپنے دور کے امیر قافلہ تھے، اور جنھوں نے ایسے تجدیدی کارنامے انجام دیئے، جن سے ملت اسلامیہ کا مستقبل روشن ہوگیا، اور بدعات وخرافات کے بادل چھٹ گئے۔

آپ کی ایک ہزار سے زیادہ تصنیفات وتالیفات اور مواعظ مطبوعہ شکل میں اب بھی موجود ہیں۔ جن کے نور سے مسلمانوں کے دل منور ہیں۔ اور گم گشتہ راہ لوگ، اسلام کی شاہراہ پانے میں کامیاب ہیں حکیم الامت حضرت تھانویؒ نے انگریزی دورِ حکومت میں ان تمام شبہات واعتراضات پر گہری نظر رکھی، جو مخالفین اسلام کی طرف سے پیدا ہوتے رہے، یا پیش کیئے جاتے رہے، اور پھر ان تمام کا معقول مدلل ومکمل جواب لکھا اور اپنے مواعظ میں بیان فرمایا، جس کی برکت سے دشمنانِ اسلام کے سارے الزامات شبہات اور اعتراضات ختم ہوگئے اور مسلمانوں کا ذہن وفکر اسلامی تعلیمات کے سلسلہ میں مطمئن اور پرسکون ہوگیا

اسی سلسلہ کی ایک کڑی اشرالجواب نامی کتاب ہے، جو اہلِ علم اور عوام وخواص میں کافی مقبول ہے، مکتبہ تھانوی دیوبند جو اس وقت دیوبند کا سب سے اہم اور مرکزی کتب خانہ ہے، اس کے مالک عزیز مکرم وقار علی سلّمہ کی خواہش ہوئی کہ یہ کتاب جسطرح اپنے مضامین میں ممتاز ہے، کتابت وطباعت میں بھی امتیازی شان سے لوگوں کے سامنے آئے اور اسے آفسٹ سے شائع کیا جائے۔

انھوں نے مجھ سے کہا کہ اس پر میں نظر ثانی چاہتا ہوں، اور ضمنی عنوانات کا اضافہ کر دیا جائے ساتھ ہی ان آیات کا ترجمہ و آحادیث نبوی کا ترجمہ کر دیا جائے، جن کا ترجمہ نہیں ہوسکا ہے، اور جہاں جہاں عربی کے سخت الفاظ آجائیں حاشیہ پر ان کا معنیٰ بھی درج کر دیا جائے،

چنانچہ اس کام کو اپنے لئے سعادت سمجھ کر پوری کتاب کا اسی نقطۂ نظر سے میں نے مطالعہ کیا، اور جو خدمت سپرد کی گئی تھی اس کی تکمیل کی سعی کی ہے، اب کتاب آپ کے سامنے ہے خود مطالعہ کرکے اندازہ لگائیں، مجھے توقع ہے اس سے اس کی افادیت میں کافی اضافہ ہوجائے گا۔

آخر میں خاکسار اپنی کتاب مشاہیر علمار دیوبند سے حضرت اقدسؒ کی مختصر سوانح نقل کر دینا ضروری سمجھتا ہے۔

حضرت حکیم الامّۃ تھانوی قدس سرّہٗ

ولادت ۱۲۸۰ھ   فراغت ۱۳۰۱ھ   وفات ۱۳۶۲ھ

آپ ۵ ربیع الثانی ۱۲۸۰ھ یوم چہارشنبہ کو بوقت صبح صادق اپنے وطن تھانہ بھون ضلع مظفرنگر میں پیدا ہوئے، پہلے حفظ قرآن کیا، فارسی مولانا فتح محمد تھانویؒ سے پڑھی، ۱۲۹۵ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخلہ لیا، مشکوٰۃ، مختصر المعانی اور ملاحسن وغیرہ سے پڑھنا شروع کیا تھا، ۱۳۰۱ھ میں باضابطہ فراغت حاصل کی، قرأت اور تجوید آپ نے قاری محمد عبداللہ مہاجر مکیؒ سے حاصل کی۔

فراغت کے بعد تدریس کیلئے کانپور تشریف لے گئے، پہلے تین چار ماہ مدرسہ فیض عام میں قیام رہا۔ پھر مستقل طور پر مدرسہ جامع العلوم میں منتقل ہوگئے اور عرصہ تک اس مدرسہ میں رہ کر درس وتدریس، افتار اور وعظ کی خدمات انجام دیتے رہے ۱۳۱۵ھ میں سب کچھ چھوڑ کر کانپور سے تھانہ بھون آگئے اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ آپ حضرت حاجی امداداللہ مہاجر مکی سے بیعت تھے۔ اور خلافت سے بھی سرفراز ہوچکے تھے، چنانچہ ربیع الاوّل ۱۳۱۵ھ سے بیعت وارشاد کی خدمت میں مشغول ہوگئے، لاکھوں علمار، صلحار، مشائخ اور خواص وعوام آپ کے میں داخل ہوئے، انمیں سے ۷۰ مجاز بیعت ہوئے، ۵۹ مجاز صحبت قرار پائے ایک ہزار سے زیادہ تصانیف اور آپ کے مواعظ شائع ہوئے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

بعد الحمد والصلوٰۃ حقیر ناچیز سراپا تقصیر علی محمد لاہوری مظہر مدعا ہے کہ حضرت اقدس سیدنا و مرشدنا حکیم الامّت مجدد الملّت جامع شریعت وطریقت مولانا ومقتدانا محمد اشرف علی صاحب تھانوی دامت برکاتہم نے اسلام پر اغیار کے اعتراضات اور خود مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے اور بالخصوص تعلیم یافتہ مسلمانوں کے اعتراضات کے جوابات اپنی مختلف تقریروں اور تحریروں میں دیئے ہیں۔ چنانچہ حصہ اوّل میں جو جناب کے سامنے موجود ہے کفار کے بیس اہم اعتراضات کے دندان شکن جوابات ہیں ان سب کو مع حوالہ صفحات واسمار مواعظ وملفوظات ایک جگہ جمع کر دیا ہے۔ اور سہولت کے لئے اور ضرورت کے وقت حوالہ دیکھنے کے لئے ان مواعظ وملفوظات کی فہرست ذیل میں نقل کرتا ہوں۔

۱:۔ روح العج والثج (۲) ملفوظات، مجادلات معدلت ملحقہ دعوات عبدیت حصہ سوم، ازالۃ الغفلۃ شعب الایمان، محاسن اسلام، الرفع والوضع، تقلیل الکلام، الحدود والقیود، افنار المحبوب۔

اس کے دوسرے حصہ میں رسومات و بدعات کی تردید اور اشبہات کا حل کثیر الوقوع اغلاط کی تردید اور اس کے تیسرے حصہ میں جدید تعلیم یافتہ حضرات کے ان شکوک وشبہات واعتراضات کا جواب جو سائنس جدید کی رو سے پیش آتے ہیں۔

کیا اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ؟ !

جواب :۔ اگر تلوار کے زور سے لوگ اسلام لاتے تو ان کے قلوب (دلوں) پر تلوار کا اثر کیسے ہوجاتا ہے اور دل پر اثر ہوجانے کی دلیل یہ ہے کہ ان کے عادات نہایت پاکیزہ اور شریعت مطہرہ کی تعلیم کے بالکل مطابق ہوگئے تھے۔ چنانچہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کی زرہ چوری ہوگئی تھی۔ ایک یہودی کے پاس ملی، آپؓ نے دیکھ کر پہچان لیا اور فرمایا کہ یہ میری زرہ ہے، یہودی کے گواہ لاؤ۔

حضرت علیؓ کی زرہ کا واقعہ

اللہ اکبر کس قدر آپ نے اسلامی تعلیم کا نمونہ اپنے کو بنا لیا تھا کہ جہاں رعایا کو زبان سے آزاد کیا، عمل سے بھی دکھلا دیا کہ ایک یہودی رعایا کی یہ جرأت ہے کہ وہ صاحب سلطنت خلیفۃ المسلمین سے کہتا ہے کہ گواہ لاؤ! حالانکہ یہود خود ایک ذلیل قوم تھی، جب سے انہوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سرکشی کی تھی اس وقت سے

برابر ذلت وخواری ہی کی حالت رہے اور اب بھی جہاں ہیں ذلیل وخوار ہی ہیں۔ سچ کہا ہے ؎

عزیزے کہ از درگہش سر بتافت — بہر درکہ شد ہیچ عزت نیافت

جس عزیز نے بھی اس کے آستانے سے منہ موڑا — وہ جس دروازہ پر گیا تمام عزتوں سے منہ موڑا

پس ایک تو اس کو قومی ذلت اور پھر یہ کہ آپ کی قلمرو (حکومت) کا رہنے والا، مگر اس پر بھی یہ جرأت ہے، صاحبو یہ ہے حقیقی آزادی نہ وہ جو آج کل اختیار کی گئی ہے کہ دین سے نکل گئے خدا کو چھوڑا، رسول کو چھوڑا، آزادی یہ ہے کہ کسی صاحب حق کی زبان بند نہ کریں، کسی پر ظلم نہ کریں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ ایک یہودی کا کچھ قرض آپؐ کے ذمہ تھا، ایک روز اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بیباکانہ کچھ الفاظ کہے صحابہ کرامؓ نے ان کو دھمکایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان لصاحب الحق مقالاً (حق والے کو بولنے کا موقع ہوتا ہے) تو آزادی یہ ہے کہ حکومت میں رعایا کو اتنا آزاد کر دیں، چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالے نے اپنے عمل سے اتنا آزاد بنا دیا تھا کہ اس یہودی نے کہا کہ گواہ لاؤ یا نالش کرو، چنانچہ حضرت شریح رضی اللہ عنہ کے یہاں جو اس وقت قاضی تھے۔ اور حضرت عمرؓ کے وقت سے اسی عہدہ جلیلہ پر چلے آرہے تھے۔ اور جاکر نالش دائر کی، دونوں مدعی اور مدعا علیہ بن کر مساوات کے ساتھ عدالت میں گئے۔ حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے موافق قاعدہ شریعت کے پوچھنا شروع کیا۔ یہ نہیں کہ امیرالمومنین رضی اللہ عنہ کے آنے سے ہلچل پڑ جائے، غرض نہایت اطمینان سے اس یہودی سے پوچھا کہ کیا زرہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی ہے؟ اس نے انکار کیا، اس کے بعد حضرت علیؓ سے کہا کہ گواہ لایئے۔

قاضی کا فیصلہ

اللہ اکبر ذرا آزادی دیکھئے کہ ایک قاضی سلطنت خود امیرالمومنین سے گواہ طلب کر رہے ہیں اور امیرالمومنین بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ جن پر احتمال دعویٰ خلاف واقعہ کا ہو ہی نہیں سکتا تھا، مگر یہ محض ضابطہ کی بدولت تھا۔ واللہ جن لوگوں نے تمدن سیکھا اسلام سے سیکھا اور پھر بھی اسلام کے برابر عمل نہ کر سکے۔ غرض حضرت علی رضی اللہ عنہ دو گواہ لائے ایک امام حسن رضی اللہ عنہ (جو آپ کے صاحبزادے تھے) اور ایک اپنا آزاد کردہ غلام جن کا نام قنبر تھا حضرت شریح رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ میں یہ مسئلہ مختلف فیہ تھا کہ حضرت شریح رضی اللہ عنہ بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں جائز نہ سمجھے تھے اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نزدیک بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں جائز تھی اس لئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کو

کو پیش کر دیا۔

آج اختلاف پر علماء کو برا بھلا کہا جاتا ہے۔ حالانکہ یہ اختلاف پہلے ہی سے چلا آرہا ہے مگر آج کل کی طرح علماء کو برا بھلا کہنا نہ تھا۔ ایک دوسرے کی تکفیر و تضلیل نہ کرتے تھے۔ آج کل سب وشتم (گالی گلوچ) کی زیادہ تر وجہ علاوہ نفسانیت کے ایک یہ بھی ہے کہ ہر جگہ اصاغر کی عملداری ہے اکابر (بڑے) خود آپس میں ملتے نہیں کہ اصل بات کا پتہ چل سکے۔ جسطرح چھوٹے کہہ دیتے ہیں اسی کو صحیح سمجھا جاتا ہے یہ نہیں کرتے کہ راوی (بیان کرنے والے) کو ڈانٹ دیں۔

غرض حضرت علیؓ کا یہ مذہب تھا کہ بیٹے کی گواہی معتبر ہے اور حضرت شریح رضی اللہ عنہ اس کو مانتے نہیں تھے۔ حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے اپنے اجتہاد پر عمل کیا اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی گواہی نہیں مانی، اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ غلام چونکہ آزاد ہو چکا ہے۔ اس کی گواہی تو مقبول ہے، مگر بجائے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے کوئی اور گواہ لایئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اور تو گواہ کوئی نہیں ہے۔ آخر حضرت شریح رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا دعویٰ خارج کر دیا۔

قاضی کے فیصلہ پر مسرت

اگر آج کل کے معتقد ہوتے تو حضرت شریح رضی اللہ عنہ سے لڑتے مرتے لیکن حضرت شریح رضی اللہ عنہ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ ان کی طرح مذہب فروش نہ تھے۔ وہ مذہب کے ہر امر پر جان فدا کرتے تھے۔ اگر حضرت شریح رضی اللہ عنہ سے پوچھا جاتا تو وہ قسم کھا کر کہہ سکتے تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ سچے ہیں۔ لیکن چونکہ ضابطۂ شریعت اجازت نہیں دیتا تھا، اس لئے آپ نے اپنی عقیدت پر کاروائی نہیں کی۔

یہودی کا قبول اسلام

آخر باہر آکر یہودی نے دیکھا کہ ان پر تو ذرا بھی ناگواری کا اثر ظاہر نہ ہوا باوجودیکہ آپ اسد اللہ ہیں (اللہ کے شیر) بر سر حکومت ہیں تو کس چیز نے ان کو برہم نہیں کیا، غور کر کے کہا کہ حقیقت میں اب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کا مذہب بالکل سچا ہے یہ اثر اسی کا ہے، لیجئے یہ زرہ آپ ہی کی ہے اور میں مسلمان ہوتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ میں نے یہ زرہ تجھی کو دی، غرض وہ یہودی مسلمان ہو گیا۔ اور آپ ہی کے ساتھ رہا۔ حتیٰ کہ ایک اسلامی لڑائی میں شہید ہو گیا۔ اب بتلایئے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار سر پر دیکھ کر مسلمان ہوا یا اس کو نیام میں دیکھ کر۔ (وعظ ازالۃ الغفلۃ ص۴۰)

اہلِ یورپ کا خیال اور اس کی تردید

اہل یورپ کا خیال ہے کہ اسلام کی اشاعت میں تلوار کے زور سے زیادہ کام لیا گیا ہے اور اس کے لئے دلیل میں وہ واقعاتِ جنگ پیش کرتے ہیں کہ سلاطین نے کس قدر خونریزیاں کی ہیں۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ یہ کوئی عاقل نہیں کہہ سکتا کہ جنگ مطلقاً تمدّن[1] کے خلاف ہے۔ آج متمدّن[2] قومیں بھی ضرورت کے موقع پر جنگ کرتی ہیں۔ معلوم ہوا کہ بروقت ضرورت لڑائی کرنا تہذیب و تمدّن کے اعتبار سے جائز ہے، بس اب میں ظالم سلاطین کی تو طرفداری نہیں کرتا البتہ خلفائے راشدین کی بابت میں دعویٰ سے کہتا ہوں کہ انھوں نے بنارِ ضعیف (کمزور بنیاد) پر کبھی جنگ نہیں کی، کسی قوی سبب کی بنا پر ہی وہ لڑائی کرتے تھے اور لڑائی کے متعلق اسلامی قانون اگر مخالفین کی نظر سے گذرتا تو کبھی یہ لفظ زبان سے نہ نکالتے، کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا ہے، قوانین جنگ اسلام نے بہت سے بتلائے ہیں مگر میں اس وقت ایک مختصر قانون بیان کرتا ہوں۔

قانونِ اسلام

اسلام کا مسئلہ ہے اور خلفائے راشدین کا اس پر ہمیشہ عمل درآمد رہا ہے کہ اگر کوئی شخص مقابلے کے وقت تمہارے باپ کو، تمہارے بیٹے کو اور تمہارے بھائی کو، غرض سب متعلقین کو قتل کر ڈالے اور عرصہ تک خونریزی کرتا رہے۔ پھر کسی وقت قابو میں آجاوے اور تم اس سے بدلہ لینا چاہو اور وہ زبان سے لاالٰہ الّا اللہ محمد رسول اللہ کہدے تو حکم ہوتا ہے کہ اس کو فوراً چھوڑ دو۔ اگرچہ تم کو کامل یقین ہو کہ اس نے جان کے خوف سے ہی کہا ہے اور دل سے اسلام نہیں لایا ہے۔ تب بھی فوراً اس سے تلوار اٹھالو ورنہ اگر تم نے اس کو مارا تو تم جہنم میں جاؤگے، اگرچہ یہ بھی خطرہ ہو کہ یہ اس وقت جان بچا کر پھر تم کو قتل کرے گا، جو کچھ چاہے ہو اب اس کا قتل کرنا ہرگز جائز نہیں۔ تو جس مذہب نے اتنی بڑی سپر ڈھال دوسروں کے ہاتھوں میں دیدی ہے، اب اس کے بارے میں کوئی کہہ سکتا ہے کہ بزورِ شمشیر پھیلا ہے یقین جانیئے اس قانون پر ہمارے سلف صالحین پوری طرح عمل کرتے تھے۔

ہرمزان کا واقعہ

ہرمزان نے مسلمان کو بہت سی ایذائیں پہنچائی تھیں آخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس گرفتار کرکے لایا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر اسلام پیش کیا مگر اس نے نہ مانا۔ آپ نے اس کے قتل کرنے کا حکم دیا اس نے ایک چال چلی کہ حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ آپ مجھے قتل تو کرتے ہی ہیں تھوڑا پانی منگادیں پینے پانی منگایا۔ جب پانی منگایا تو

[1] شائستگی [2] اپنے کو مہذب کہنے والا۔

اس نے کہا کہ مجھ کو اندیشہ ہے کہ پانی نہ پی سکوں اور جلاّد مجھ پر تلوار چلادے۔ آپ نے فرمایا نہیں جب تک تم یہ پانی نہ پی چکوگے تو اس وقت تک قتل نہ کئے جاؤگے۔ یہ سنکر اس نے پانی فوراً زمین پر پھینک دیا، اور کہا کہ اب مجھ کو قتل نہیں کرسکتے، کیونکہ اس پانی کا پینا ممکن نہیں اور اس کے پینے تک مجھ کو امن تھا۔ آپ نے اس کو آزاد کردیا۔ ہرمزان کو اپنی ذات پر اتنا بھروسہ تھا کہ وہ خوب جانتا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس فرمان پر کہ تم جب تک پانی نہ پی چکوگے قتل نہ کئے جاؤگے ہرگز قتل نہ کریں گے، یہ واقعہ دیکھکر ہرمزان فوراً اسلام لے آیا کہ واقعی یہ دین برحق ہے جس میں مخالف کے ساتھ بھی اتنا سلوک کیا جاتا ہے۔

اس واقعہ کو بیان کرنے سے میرا مقصود یہ ہے کہ اسلام کی یہ تعلیم ہے اور اس پر خلفاء نے اس طرح پابندی کی ہے کہ انکی نظیر آج تک کوئی دکھا نہیں سکتا۔ ہاں پچھلے بادشاہوں کے ہم ذمہ دار نہیں ہیں اگر انھوں نے ظلم کیا ہے بھگتیں گے۔ ہمارے اسلاف نے ان قوانین پر پورا عمل کیا۔ اور ان کو ترقی و عروج بھی ایسا نصیب ہوا جو کسی قوم کو نصیب نہیں ہوا۔ صحابہؓ کے طرز کا دوسری قوموں پر ایسا اثر تھا کہ بہت لوگ جاسوس بن کر آئے مگر ان حضرات کو دیکھکر مسلمان ہوگئے۔

(وعظ شعب الایمان ص۱۱۴)

ہندوستان کی مثال

لوگ اسلام کو بدنام کرتے ہیں کہ وہ تلوار کے زور سے پھیلا ہے۔ واللہ بالکل غلط ہے۔ اگر مسلمانوں لوگوں کے زور سے مسلمان کیا کرتے تو آج ہندوستان میں جہاں اسلامی حکومت چھ سو برس تک رہی ہے ایک بھی ہندو باقی نہ رہتا۔ مولانا محمد قاسم[1] صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا جواب اس اعتراض کے متعلق یہ ہے کہ اگر اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے تو یہ بتلاؤ کہ وہ شمشیر زن کہاں سے آئے تھے؟ کیونکہ تلوار خود سے تو چل نہیں سکتی تو جن لوگوں نے سب سے پہلے تلوار چلائی ہے یقیناً وہ تلوار سے مسلمان نہیں ہوئے تھے، کیونکہ ان سے پہلے تلوار چلانے والا کوئی تھا ہی نہیں، تو ثابت ہوگیا کہ اسلام تلوار سے نہیں پھیلا۔

مدینہ میں اسلام

تاریخ سے ثابت ہے کہ جہاد مدینہ منورہ میں آکر شروع ہوا اور اہل مدینہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے ہی زیادہ تر مسلمان ہوچکے تھے، آخر ان کو کس تلوار نے مسلمان کیا تھا اور مکہ معظمہ میں جو کئی سو آدمی مسلمان ہوئے اور کفار کے ہاتھوں سے اذیتیں برداشت کرتے رہے وہ کس تلوار سے مسلمان ہوئے تھے۔

[1] بانی دارالعلوم دیوبند

جبشہ میں اسلام پھر ہجرت مدینہ منورہ سے پہلے بعض صحابہؓ نے جبشہ کی طرف ہجرت کی ہے اور وہاں کفار قریش کے ساتھ مسلمانوں کا مناظرہ ہوا اور نجاشی شاہ جبشہ نے حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی زبان سے قرآن شریف سنکر بے تحاشہ رونا شروع کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور قرآن شریف کی حقانیت کی گواہی دی اور اسلام قبول کیا۔ اس پر کسی کی تلوار تلوار چلی تھی۔ اسی طرح صدہا واقعات تاریخ میں موجود ہیں جن سے ثابت ہے کہ اسلام محض اپنی حقانیت سے پھیلا ہے۔

خصوصًا عرب کی قوم جو جنگ جوئی میں شہرۂ آفاق ہے وہ کبھی اور کسی طرح تلوار کے خوف سے اسلام کو قبول نہ کر سکتی تھی ان کے نزدیک لڑنا مرنا معمولی بات تھی مگر دب کر دین کا بدلنا سخت عیب ہے وہ ہرگز تلوار کے خوف سے اسلام نہیں لا سکتے تھے۔ اس پر شاید یہ سوال ہو کہ پھر جہاد کس لئے مشروع ہوا تو خوب سمجھ لو کہ جہاد حفاظت اسلام کے لئے مشروع ہوا نہ کہ اشاعت اسلام کے لئے اور ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ لوگ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے غلطی میں پڑے ہوئے ہیں

جہاد کا منشا جہاد کی مثال آپریشن جیسی ہے کیونکہ مادے دو قسم کے ہوتے ہیں ایک متعدی اور ایک غیر متعدی جو مادہ غیر متعدی ہوتا ہے اس کو دواؤں کے ذریعہ سے دبایا جاتا ہے، کوئی مرہم لگا دیا، یا اس کی مالش کردی وہ دب گیا۔ اور متعدی مادہ کے لئے آپریشن کیا جاتا ہے، اس کو چیر کر نکال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح دشمنانِ اسلام دو طرح کے ہیں بعض تو جن سے صلح کرینی مناسب ہوتی ہے وہ صلح کر کے مسلمانوں کو ستانا چھوڑ دیتے ہیں اور ان سے تو صلح و مصالحت کرلی جاتی ہے بعض ایسے موذی اور مفسد ہوتے ہیں کہ صلح پر آمادہ نہیں ہوتے یہ مادہ متعدیہ ہے ان کے واسطے آپریشن کی ضرورت ہے۔ اسی کا نام جہاد ہے پس جہاد سے لوگوں کو مسلمان بنانا مقصود نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی حفاظت مقصود ہے۔

لوگ عالمگیر رحمۃ اللہ علیہ کو بدنام کرتے ہیں کہ انھوں نے ہندوں کو زبردستی مسلمان کیا ہے یہ بالکل غلط ہے۔ عالمگیر رحمۃ اللہ پابند شرع تھے۔ بارہ ہزار تین احادیث کے حافظ تھے۔ قرآن شریف لکھ کر ہدیہ کر کے گذارا کرتے تھے۔ اپنے خرچ میں خزانہ کا ایک پیسہ نہ لاتے تھے۔ ان کے سامنے لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ کا حکم موجود تھا۔ وہ اس کے خلاف کیونکر کر سکتے تھے یہ تو پہلے واقعات تھے۔ ان سے قطع نظر کر کے میں پوچھتا ہوں کہ اچھا اس وقت جو لوگ ہندوستان میں اسلام لاتے ہیں وہ کیوں مسلمان ہوتے ہیں،

ان پر کون سی تلوار کا زور ہے یقینًا اس وقت کسی طرح بھی ان پر زور نہیں ہے بلکہ ہر طرح آزادی ہے نہ ہم ان کو کسی طرح کی طمع دلا سکتے ہیں۔ مسلمان کے پاس اتنا مال ہی نہیں جو وہ طمع دلا کر کسی کو مسلمان کریں بلکہ یہ حالت ہے کہ آج کوئی نو مسلم اسلام لایا تو کل کو اس سے بھی دینی کاموں میں چندہ مانگتے ہیں اور اگر کوئی اسلام لاتے وقت ہم سے روپیہ کی درخواست کرے تو ہم صاف کہتے ہیں کہ تم اپنی نجات کے واسطے اسلام لاتے ہو تو لاؤ ورنہ ہم کو لالچ کے ساتھ مسلمان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ جو دولت ہم تم کو دے رہے ہیں اس کے مقابلہ میں اگر تم خود ہم کو نذرانہ دو تو بہت بجا ہے، لیکن باوجود اس آزادی اور اس استغنار کے پھر بھی بہت سے لوگ اسلام لاتے ہیں اور لا رہے ہیں۔ اور اسلام لاتے ہی ان کی ایسی حالت ہوتی ہے کہ گویا بچھڑا ہوا محبوب ان کو مل گیا۔ ایک ہندو اسلام لانے کے بعد خدا کی محبت اور اس کی یاد میں اس قدر روتا تھا کہ جس کا بیان نہیں اور کہتا تھا مجھ کو تو اب معلوم ہوا کہ خدا کس کو کہتے ہیں۔ غرض اس کی عجیب حالت تھی۔ (وعظ محاسن اسلام ص۴۸)

کیا خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کردے

جواب :- (۱) اسلام وہ چیز ہے کہ اس کے بغیر مغفرت و نجات ممکن نہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ خدا اس پر قادر نہیں کہ کافر کی مغفرت کردے بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ کافر کی مغفرت چاہیں گے نہیں۔ گو قادر ضرور ہیں۔ ورنہ تعذیب کافر پر خدا کا مضطر ہونا لازم آئے گا۔ اور اضطرار منافی وجوب ہے۔ اور بدون ایمان واسلام کے حق تعالیٰ کا کسی کی مغفرت نہ چاہنا قرآن شریف میں جا بجا مذکور ہے چنانچہ ایک آیت تو وہی ہے ان اللہ لایغفر ان یشرک بہ[1] مگر شاید اس پر کوئی شبہ کرے کہ یہاں تو صرف مشرک کا ذکر ہے کفر کا ذکر ہی نہیں۔ اور بعض کافر ایسے بھی ہیں جو مشرک نہیں بلکہ موحد ہیں، مگر اسلام سے آبار کرتے ہیں۔ ان کی مغفرت نہ ہونا اس آیت میں کہاں مذکور ہے تو اس لئے دوسری جگہ مذکور ہے۔

ان الذین کفروا من اہل الکتاب والمشرکین فی نار جہنم خالدین فیہا اولٰئک ہم شر البریۃ — ترجمہ۔ بیشک اہل کتاب اور مشرکوں میں سے جنھوں نے کفر کیا وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ رہینگے یہ لوگ دنیا میں بدترین ہیں

---

[1] بیشک اللہ شرک کرنے والوں کو نہیں بخشے گا۔

اس میں کافر کو اہل کتاب اور مشرکین کا مقسم قرار دیا گیا ہے اور دونوں کے لئے خلود فی جہنم مذکور ہے جس سے کافر کی مغفرت نہ ہونا بھی معلوم ہو گئی اور یہ شبہ نہیں رہا کہ یہاں تو صرف خلود کا ذکر ہے جس کے معنی مکث[1] طویل کے آتے ہیں اور اس کے لئے دوام لازم نہیں۔ جواب یہ ہے کہ دوام (ہمیشگی) خلود کے منافی بھی نہیں۔ پس اگر کوئی قرینہ قائم ہو تو خلود سے دوام کا قصد ہو سکتا ہے۔ اور یہاں خلود بمعنی دوام ہونے پر قرینہ قائم ہے۔ وہ یہ کہ مشرکین کیلئے خلود بمعنی دوام ہی ہو گا۔ اور یہاں کافر مشرک دونوں کا حکم مذکور ہے جب مشرکین کیلئے خلود بمعنی دوام ہے تو کافر کے لئے بھی دوام ہی ہو گا۔ ورنہ کلام واحد میں ایک لفظ سے جدا جدا معنی کا قصد لازم آئے گا۔ اور یہ ممتنع[2] ہے۔ علاوہ ازیں یہ کہ بعض آیات میں کافر کے لئے خلود کو دوام سے موصوف بھی کیا گیا ہے۔

چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے. والذین کفروا قطعت لهم ثیاب من نار الی قوله تعالٰی کلما ارادوا ان یخرجوا منها من غم اعیدوا فیها اور ارشاد فرماتے ہیں والذین کفروا عن سبیل الله ثم ماتوا وهم کفار فلن یغفر الله لهم۔

پس کافر کا بھی ہمیشہ کے لئے معذب ہونا صاف طور سے ثابت ہو گیا جس سے اسکی عدم مغفرت بھی ثابت ہو گئی۔ اور یہاں سے ایک اشکال کے مندفع ہونے پر تنبیہ کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ خلود کے معنی مکث طویل ہونے سے اس آیت کی تفسیر واضح ہو گئی جو قاتل عمد کے بارے میں وارد ہے۔ من یقتل مؤمنا متعمدا فجزاؤه جهنم خالدا فیها کہ اس سے قاتل عمد کی توبہ کا قبول ہونا لازم نہیں آتا کیونکہ اس میں خلود بدون قید دوام مذکور ہے اور خلود دوام کو مستلزم نہیں نہ کوئی قرینہ یہاں ارادۂ دوام کے مرجح ہے اس لئے مدلول آیت صرف اس قدر ہے کہ قاتل عمد کو زمانہ دراز تک عذاب جہنم ہو گا۔ مگر کسی وقت نجات ہو جائیگی گو مدت دراز ہی کے بعد ہو اور جب وہ مستحق نجات ہے تو اس کی توبہ بھی قبول ہونی چاہیئے اس میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا اختلاف ہے کہ ان کے نزدیک قاتل عمد کے لئے توبہ نہیں مگر اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے نزدیک قبول ہے پھر صحابہؓ کے بعد تابعین و تبع تابعین ائمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہو گیا کہ اس کی توبہ قبول ہو سکتی جب کہ قاعدہ شرعیہ سے ہو اور قاعدہ ہے کہ اجماع متاخر اختلاف مقدم کو رافع ہوتا ہے لہذا اب مسئلہ اجماعی ہے مگر کفار مشرکین کے لئے دوسری بعض آیات میں خلود کے ساتھ دوام بھی مذکور ہے۔ اس لئے وہاں مغفرت کا کوئی احتمال نہیں۔

---

[1] زیادہ دنوں رہنا۔ [2] ناممکن۔ دشوار۔

کیونکہ خلود کے معنی بہت دن رہنا ہے اور ابد وہ ہے جس کا کبھی انقطاع نہ ہو۔ حاصل یہ ہوا کہ کفار و مشرکین جہنم میں ایسی دراز مدت کے لئے داخل ہوں گے جس کا انقطاع نہ ہو گا اور ظاہر ہے کہ کفر کہتے ہیں خلاف اسلام کو اس کے ساتھ شرک بھی ہو یا نہ ہو۔ دونوں کے لئے سزا ابدالاباد جہنم ہے جب ترکِ اسلام کی یہ سزا ہے تو اس سے اسلام کی نوعیت و فضیلت اور اسکی ضرورت کا درجہ معلوم ہو گیا۔ (ایضاً ص۱۷)

اللہ تعالیٰ بغیر زبان کے کیسے کلام فرماتا ہے

ایک ہندو جو اپنے گروہ میں عابد کہلاتا ہے میرے پاس اپنے ایک پنڈت کیساتھ آیا اور یہ سوال کیا کہ آپ لوگ قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ کا کلام کہتے ہیں، حالانکہ کلام بے زبان کے ہو نہیں سکتا۔ اور اللہ تعالیٰ کے زبان ہے نہیں پھر اس نے کلام کیسے کیا، میں نے جواب دیا کہ ہم کو کلام کے لئے زبان کی ضرورت ہے لیکن خود زبان کو کلام کرنے کیلئے زبان کی ضرورت نہیں وہ خود اپنی ذات سے کلام کرتی ہے۔ اسی طرح ہم کان سے سنتے ہیں لیکن خود کان اپنی ذات سے سنتا ہے اس کو کسی اور آلہ کی ضرورت نہیں، ہم کو دیکھنے کیلئے آنکھ کی ضرورت نہیں وہ اپنی ذات سے دیکھتی ہے تو جب زبان اس پر قادر ہے کہ بے زبان کلام کرے تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کو کلام کے لئے کسی آلہ کی ضرورت نہ ہو تو کیا تعجب ہے صفت کلام خود اس کی ذات میں موجود ہے۔ کلام خود اس کی ذات سے بلا زبان صادر ہوتا ہے۔ وہ ہندو اس جواب سے بہت خوش ہوا اور اپنے ہمراہی سے کہا دیکھو اس کو علم کہتے ہیں۔ پھر حضرت والا نے فرمایا کہ اس سے پہلے کبھی میرے ذہن میں یہ جواب نہ تھا۔ الحمد للہ کہ اسی وقت منجانب اللہ یہ جواب میرے ذہن میں آیا۔ (مجادت معدلت ملحقہ دعوات عبدیت حصہ سوم)

شریعت میں کفر کی سزا دائمی عذاب جہنم کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تمہارا مقدمہ تو مسلّم ہے کہ سزا جنایت (جرم) کے مناسب ہونی چاہیئے مگر کیا مناسب کے معنیٰ یہ ہیں کہ جنایت اور سزا دونوں کا زمانہ بھی مناسب ہو۔ اگر یہی بات ہے تو چاہیئے کہ جس جگہ دو گھنٹہ تک ڈکیتی پڑی ہو اور ڈاکو گرفتار ہو گئیں تو حاکم ڈاکوؤں کو

دو گھنٹے کی سزا دیدی۔ اگر حاکم ایسا کرے تو کیا آپ اس کو انصاف در مانیں گے اور سزا کو جنایت کے مناسب مانیں گے۔ ہرگز نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ سزا اور جنایت میں مناسبت کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ دونوں کا زمانہ مناسب ومساوی (برابر) ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ سزا میں شدت بقدر شدت جرم ہو اب تم خود فیصلہ کرلو شریعت نے کفر کی سزا میں جو شدت بیان کی ہے وہ شدت جرم کے مناسب ہے یا نہیں۔ اور یہ جرم شدید وسخت) ہے یا نہیں۔ شاید آپ کہیں کہ جرم شدید تو ہے مگر نہ ایسا شدید کہ اس کی سزا ابدالآباد جہنم ہو، میں کہوں گا کہ یہ خیال آپ کو اس لئے پیدا ہوا کہ تم نے صرف فعل کی ظاہری صورت پر نظر کی ہے حالانکہ سزا وجزا کا مدار محض اس کی ظاہری صورت پر نہیں ہے، بلکہ نیت کو بھی اس میں بڑا دخل ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اصل مدار نیت ہی پر ہے۔

ایک مثال:- چنانچہ اگر ایک شخص دھوکے سے شراب پی لے تو اس کو گناہ نہیں ہوا۔ گو صورت گناہ موجود ہے۔ کیونکہ نیت نہ تھی۔ اگر ایک شخص شراب پینے کے لئے دوکان پر جائے اور دوکاندار بجائے شراب کے کوئی شربت اس کو دیدے جسے یہ شراب سمجھ کر پیئے تو اس کو گناہ ہوگا۔ کیونکہ اس کی نیت تو اس کی شراب پینے ہی کی تھی۔ اس لئے فقہاء نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص اپنی بیوی سے مجامعت (صحبت) کرلے، مگر وہ اندھیرے میں یہ سمجھتا ہے کہ یہ میری بیوی نہیں بلکہ کوئی اجنبی عورت ہے تو اس کو گناہ ہوگا اسی طرح مجامعت میں تصور کسی اجنبیہ کا کرے، یعنی بیوی سے مجامعت کرتے ہوئے یہ تصور کرے کہ میں گویا فلاں اجنبیہ سے مجامعت کررہا ہوں، اور اس کی صورت ذہن میں حاضر ہو، اس سے لذت لے تب بھی گناہ ہوگا اور اگر شب زفاف میں عورتوں نے اس کے پاس غلطی سے بجائے اس کی بیوی کے کسی دوسری عورت کو بھیج دیا جس کے ساتھ یہ شخص یہ سمجھ کر ہم بستر ہوا کہ یہی میری بیوی ہے تو اس کو گناہ نہ ہوگا اور یہ وطی زنا میں شمار نہ ہوگی بلکہ وطی بالشبہ ہوگی جس سے ثبوت نسب بھی ہوجاتا ہے اور عدت بھی لازم ہوتی ہے۔

جب یہ بات معلوم ہوگئی تو سمجھو کہ ظاہر میں گو کفر کافر متناہی ہے۔ مگر اس کی یہ نیت تھی کہ اگر زندہ رہا تو ابدالآباد (ہمیشہ ہمیشہ) اسی حالت میں رہے گا اس لئے اپنی نیت کے موافق اس کو ابدالآباد جہنم کا عذاب ہوگا۔ اور اسی طرح مسلمان کا اسلام گو متناہی ہے مگر اس کی نیت یہ ہے کہ اگر میں ہمیشہ زندہ رہوں گا تو ہمیشہ اسلام پر مستقیم رہوں گا

اس لئے ابدالآباد تک ثواب جنت میں ملے گا۔

(۲) دوسرا ایک دقیق (باریک) جواب یہ ہے کہ کفر سے حقوق الہیہ کی تفویت ہے اور حقوق الہیہ غیر متناہی ہیں تو ان کی تفویت کی سزا بھی غیر متناہی ہونی چاہیئے اور اسلام میں حقوق الہیہ کی رعایت ہے اور وہ غیر متناہی ہیں تو انکی رعایت کا بدلہ بھی غیر متناہی ہونا چاہیئے الحمدللہ اب یہ اشکال بالکل مرتفع ہوگیا۔ (محاسن اسلام ص۲۰)

کیا مسلمان کعبہ کی پرستش کرتے ہیں؟

جواب یہ ہے کہ ہم کعبہ کی پرستش نہیں کرتے بلکہ عبادت خدا کی کرتے ہیں اور صرف منہ قبلہ کیطرف کرتے ہیں اور اس کے لئے ہمارے پاس بہت سے دلائل ہیں ایک یہ کہ ہم خود اس کی معبودیت کی نفی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ کوئی عابد اپنے معبود کی معبودیت کی نفی نہیں کیا کرتا دوسرے یہ کہ نماز پڑھتے ہوئے اگر کسی کے دل میں کعبہ کا خیال بھی نہ آئے، مگر کعبہ کی طرف منہ رہے تو نماز درست ہے چنانچہ بہت لوگ ایسے ہیں کہ مسجد میں اگر نماز شروع کردیتے ہیں اور کعبہ کا خیال تک ان کو کچھ نہیں آتا پھر بھی ان کی نماز درست ہوتی ہے۔ اگر ہم کعبہ کی عبادت کرتے تو اس کی نیت کرنا شرط ہوتا مگر ایسا نہیں ہوتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر کسی وقت کعبہ نہ رہے جب بھی نماز فرض رہے گی، اور اس کی طرف منہ کیا جاوے گا جہاں کعبہ موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان پتھر اور اینٹ کو نہیں پوجتے ورنہ انہدام کعبہ کے بعد نماز موقوف ہوجاتی۔ چوتھے یہ کہ اگر کوئی شخص سقف کعبہ پر نماز پڑھے تو اس کی نماز درست ہے اگر کعبہ مسلمانوں کا معبود ہوتا تو اس کے اوپر چڑھ کر نماز صحیح نہ ہوتی۔ کیونکہ اب اس کے سامنے نہیں ہے۔ دوسرے معبود (خدا) کے اوپر چڑھنا گستاخی ہے، اس حالت میں کسی طرح نماز درست نہ ہونا چاہیئے تھی مگر فقہاء نے تصریح کی ہے کعبہ کی چھت پر بھی نماز صحیح ہے تو کیا معبود کے اوپر چڑھا کرتے ہیں۔ ہاں معترضین نے اپنے اوپر قیاس کیا ہوگا کہ وہ گائے اور بیل کو دیوتا اور معبود بھی سمجھتے ہیں پھر ان کے اوپر سواری بھی کرتے ہیں مگر اس کا خلاف عقل ہونا ظاہر ہے۔ (ایضًا)

کعبہ کی طرف منہ کرنیکا راز:- اب آپ کو بتلاتا ہوں کہ استقبالِ قبلہ کا راز یہ ہے کہ عبادت کی روح دلجمعی اور یکسوئی ہے بدوں دلجمعی اور یکسوئی کے عبادت کی صورت ہی صورت ہوتی ہے رُوح نہیں پائی جاتی اور یہ ایسی بات ہے جسکو تمام اہل ادیان تسلیم کرتے ہیں۔ اب سمجھئے کہ اجتماع خواطر میں اجتماع ظاہر کو بہت بڑا دخل ہے اس لئے نماز میں سکون اعضاء کا امر ہے۔ التفات و عبث سے ممانعت ہے صف کے سیدھا کرنے کا امر ہے کیونکہ صف کے ٹیڑھا کرنے سے قلب پریشان ہوتا ہے، عام قلوب کو اس کا احساس کم ہوگا، کیونکہ ان کو دلجمعی و یکسوئی بہت کم نصیب ہے۔ مگر جن کو نماز میں دلجمعی کی دولت نصیب ہے ان سے پوچھئے کہ صف ٹیڑھی ہونے سے قلب پر کیا اثر ہوتا ہے، صوفیہ قسم کھاکر کہتے ہیں صف غیر متکلم سے قلب کو ہیجان و پریشان ہوتی ہے۔ اس دلجمعی کیلئے سجدہ گاہ پر نظر جمانے کی تاکید ہے۔ کیونکہ جگہ جگہ نظر گھمانے سے بھی قلب کو یکسوئی حاصل نہیں ہوتی۔ پس نماز میں اگر ایک خاص جہت مقرر نہ ہوتی تو کوئی کسی طرف منہ کرتا کوئی کسی طرف منہ کرتا، اس اختلافِ جہات و تباین ہیئات سے تفرق قلب ہوتا لہذا یکسوئی کیلئے ایک خاص جہت مقرر کردی گئی۔

کعبہ کی خصوصیت

رہا یہ کہ کعبہ ہی کی جہت کیوں مقرر ہوئی۔ اور جہت کیوں نہیں ہوئی؟ اس سوال کا کسی کو حق نہیں۔ کیونکہ یہ سوال دوسری جہت کو بھی ہوسکتا ہے۔ کہ یہی کیوں ہوئی۔ دوسری کیوں نہ ہوئی۔ دیکھئے عدالت وقت مقرر کرتی ہے کہ کچہری کا وقت فلاں وقت تک ہے تو آپ یہ سوال تو کرسکتے ہیں کہ وقت کرنیکی کیا ضرورت ہے جس کا جواب یہ دیا جائے گا۔ تاکہ کام کرنے والے سب کے سب معًا (ساتھ) حاضر ہوسکیں اور رعایا اہل حاجت کو وقت مقرر ہونے سے اطمینان ہوجائے کہ عدالت کا یہ وقت ہے تو اس کے علاوہ اوقات میں وہ اپنے دوسرے کام کرسکیں اگر وقت مقرر نہ ہو تو ہر شخص کو تمام دن عدالت میں ہی رہنا پڑے کہ نہ معلوم کس وقت حاکم آجائے باقی اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ گورنمنٹ نے دس بجے سے چار بجے ہی تک کا وقت کیوں مقرر کیا کوئی اور وقت مقرر کردیا ہوتا کیونکہ وہ کوئی بھی وقت مقرر کرتی یہ سوال تو کبھی ختم نہ ہوسکتا تھا۔ علیٰ ہذا ہم کو یہ بتلانے کی ضرورت نہیں کہ جہت کعبہ ہی کو استقبال کے لئے کیوں مخصوص کیا گیا۔ ہاں ہم نے اس کا راز بتلادیا کہ خاص جہت کے تعین میں کیا مصلحت ہے۔ یہ جواب تو ضابطہ کا ہے۔ اور طالب

کے لئے یہ جواب ہے کہ حق تعالےٰ کو معلوم ہے کہ ان کی (یعنی حق تعالےٰ کی توجہ کسطرف زیادہ ہے جس طرف ان کی توجہ زیادہ تھی اسی کو جہت صلوٰہ مقرر فرمایا ہے۔

کعبہ پر تجلیات الٰہی

رہا یہ کہ یہ کیسے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی توجہ کعبہ کی طرف زیادہ ہے سو جن کے آنسو ہیں وہ جانتے ہیں کہ واقعی کعبہ پر تجلیات الٰہیہ بہت زیادہ ہیں اور توجہ سے یہی مراد ہے اور وہی تجلیات رُوح کعبہ اور حقیقت کعبہ ہیں یہی وجہ ہے کہ کعبہ ظاہری کی چھت پر بھی نماز ہوجاتی ہے کیونکہ اس وقت کو صورت کعبہ سامنے نہیں مگر حقیقت کعبہ یعنی تجلی الٰہیہ تو سامنے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان اصل تجلی الٰہی کا استقبال کرتے ہیں کعبہ کی دیواروں کا استقبال نہیں کرتے مگر چونکہ تجلی الٰہی کا احساس ہر شخص کو نہیں ہوتا اسلئے حق تعالیٰ نے اس خاص بقعہ کی حد مقرر فرمادی جس پر ان کی تجلی دوسرے مکانوں سے زیادہ ہے۔ پس یہ عمارت محض اس تجلی اعظم کی جگہ دریافت کرنے کیلئے ہے ورنہ خود عمارت مقصود بالذات نہیں چنانچہ انہدام عمارت کے بعد نماز کا موقوف نہ ہونا اور کعبہ کی چھت پر نماز کا درست ہونا اسکی دلیل ہے۔ فقہاء نے اس راز کو سمجھا ہے اس لئے وہ فرماتے ہیں کہ قبلہ رُخ وہ ہوا ہے جو کعبہ کی محاذات میں آسمان تک اور اس کے نیچے زمین کے اسفل طبقات تک ہے لیکن چونکہ عمارت کعبہ اور اس جگہ کو تجلی الٰہی سے تلبس ہے اس تلبس کی وجہ سے اس میں بھی برکت آگئی۔

ایضاً ص ۶۶

حجر اسود کو بوسہ دینے کی وجہ

جواب یہ ہے کہ تقبیل حجر عظمت سے نہیں بلکہ محبت سے ہے جیسے بیوی بچوں کا بوسہ لیا کرتے ہیں۔ اگر بوسہ دینا عظمت کی دلیل ہے تو لازم آئے گا کہ ہر شخص اپنی بیوی کی عبادت کرتا ہے اور اس کا لغو ہونا بدیہی ہے معلوم ہوا کہ تقبیل (بوسہ دینا) عبادت و تعظیم کو مستلزم نہیں بلکہ کبھی محبت سے بھی تقبیل ہوا کرتا ہے۔ رہا یہ سوال کہ تم حجر اسود سے محبت کیوں کرتے ہو اس کا جواب یہ ہے کہ میرے گھر کی بات ہے اس کے متعلق مخالف کو سوال کرنے کا حق نہیں۔ دیکھئے اگر کوئی شخص عدالت میں یہ مقدمہ دائر کردے کہ فلاں مکان میری ملکیت میں ہے تو اس سے اس پر ثبوت طلب کیا جائے گا۔ لیکن جب وہ ثبوت پیش کردے گا تو خصم (مخالف) کو اس سوال کا حق نہیں کہ اچھا مکان تو تمہارا ہی ہے مگر یہ بتلا دو کہ اس گھر میں کیا کیا سامان

موجود ہے۔ یا کوئی شخص بیوی کا بوسہ لے تو اس سے یہ سوال تو ہو سکتا ہے کہ تم اس کا بوسہ کیوں لیتے ہو، لیکن جب وہ یہ بتلادے کہ میں محبت کی وجہ سے بوسہ لیتا ہوں، تو پھر اس سوال کا کسی کو حق نہیں کہ تم کو بیوی سے محبت کیوں ہے۔ اور تم رات دن میں کتنے اس کے بوسے لیتے ہو،

اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس کی وجہ نہیں بتلا سکتے کہ ہم کو حجر اسود سے محبت کیوں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ مخالفین کے اعتراض کا جواب اسی حد تک دینا چاہیئے جہاں تک ان کو سوال کا حق ہے اور جو سوال ان کے منصب سے باہر ہو اس کا جواب نہ دینا چاہیئے بلکہ صاف کہہ دینا چاہیئے کہ تم کو اس سوال کا کوئی حق نہیں۔ مخالفین کا دماغ ہر بات کی حقیقت سمجھنے کے قابل نہیں۔ امور دقیقہ کو ان کے سامنے نہ بیان کرنا چاہیئے۔ بعض لوگ اس پر تعجب کرتے ہیں کہ وہ وجہ کونسی ہے جس کو ہم نہیں سمجھ سکتے ہیں آخر ہم بھی تو انسان ہیں اگر باریک بات ہمارے سامنے بیان کیجائے تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کو ہم نہیں سمجھ سکیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر ایسی بات ہے تو میں ایک ریاضی داں سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اقلیدس کی کوئی شکل ایک گھس کھدے کو سمجھا دیں۔ جس نے اقلیدس کے مبادی و اصول موضوعہ کو کبھی نہ سنا ہو یقیناً وہ اقرار کرے گا کہ میں ایسے شخص کو اقلیدس کے اشکال نہیں سمجھا سکتا۔ آخر کیوں کیا وہ انسان نہیں۔ مگر بات وہی ہے کہ بعض امور کے لئے مبادی و مقدمات کا سمجھنا ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے ذہن میں مبادی و مقدمات حاضر ہوں ہر شخص اس کو نہیں سمجھ سکتا اور یہ بالکل موٹی بات ہے مگر حیرت ہے کہ آجکل کے عقلاء کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔

حجر اسود کو بوسہ دینے کا راز

میں تبرعاً اس کا راز بھی بتلائے دیتا ہوں تقبیل حجر اسود کے راز کے متعلق میں کہہ چکا ہوں کہ اس کا منشاء عظمت و عبادت نہیں بلکہ محض محبت اس کا منشاء ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اس حقیقت کو مجمع عام میں ظاہر کر دیا۔ ایک بار آپ طواف کر رہے تھے اس وقت کچھ لوگ دیہات کے موجود تھے۔ جب آپ رض نے تقبیل حجر کا ارادہ کیا تو حجر کے پاس ذرا ٹھہرے اور فرمایا انی اعلم انک الحجر الخ صـ ۳۰ ۔

یعنی میں جانتا ہوں کہ تو ایک پتھر ہے جو نہ کچھ نفع دے سکتا ہے اور نہ ضرر دے سکتا ہے اور اگر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تجھے بوسہ دیتے ہوئے نہ دیکھتا تو میں بھی تجھے بوسہ نہ دیتا، کیا خشک معاملہ کیا ہے۔ حجر کے ساتھ۔ بھلا اگر مسلمان کا یہ معبود ہوتا تو کیا اس سے بھی خطاب کیا جاتا کہ نہ تو

نفع دے سکتا ہے نہ ضرر پہونچا سکتا ہے اس سے صاف معلوم ہوگیا کہ اس تقبیل کا منشاء محض محبت کی وجہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بوسہ دیا ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فضلہ بھی کسی جگہ گرا ہو تو ہم کو اس جگہ سے محبت ہوگی۔ چہ جائے کہ وہ جگہ جہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ لگے ہوں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آپ کا دہن مبارک لگا ہو ؎

بامید آنکہ جاناں روزے رشیدہ باشد ۔۔۔ باخاک آستانش داریم جبہہ سائی

رہا یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیوں بوسہ دیا اس سوال کا کسی کو حق نہیں اور نہ ہم کو اس کو وجہ بتلانا ضروری ہے۔ ہاں اتنی بات یقین ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور عبادت و عظمت کے بوسہ نہیں دیا۔ ورنہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس بیباکی کیساتھ لا تضر و تنفع نہ فرماتے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج شناس تھے۔ جب انھوں نے حجر کیساتھ یہ معاملہ کیا تو یقیناً اس تقبیل کا منشاء عبادت ہرگز نہیں اور تبرعاً اس کا جواب بھی بتلائے دیتا ہوں کہ ممکن ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حجر کے اندر تجلیات الہیہ کا بہ نسبت دوسرے حصص بیت کے زیادہ ہونا منکشف ہوا ہو پس منشاء اس تقبیل کا تلبس زائد ہے۔ تجلیات الٰہیہ سے اور جس چیز کو محبوب کے انوار سے تلبس ہو اس کا بوسہ دینا اقتضائے محبت ہے ؎

امر علی الدیار الخ صـ ۳۱

غلامی کا مسئلہ کیا اسلام میں قابل اعتراض ہے؟

جواب: معاشرت میں اسلام کا یہ حکم ہے کہ اپنے غلاموں کی ستر خطائیں روز معاف کیا کرو اس سے زیادہ خطائیں ہوں تو کچھ سزا دو۔ بھلا غلاموں کے ساتھ یہ برتاؤ کوئی غیر مسلم کر سکتا ہے۔ غلام تو کجا اولاد کے ساتھ بھی کوئی ایسا برتاؤ نہیں کر سکتا مگر افسوس باوجود اس قدر رعایت کے پھر بھی مخالفوں کو اسلام کے مسئلہ غلامی پر اعتراض ہے میں کہتا ہوں کہ اسلام نے تو غلاموں کے ساتھ وہ برتاؤ کیا ہے کہ ان کے باپ بھی ان کے ساتھ ویسا نہیں کر سکتے تھے۔

مسئلہ غلامی کی اصل

مسئلہ غلامی کی اصل یہ ہے کہ اس میں مخلوق کی جان بچائی گئی ہے کیونکہ جب ایک دشمن مسلمانوں کے مقابلے میں فوج کشی کرتا ہو اور اس کے ہزاروں لاکھوں آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہوں تو اب ہمیں کوئی بتلا دے کہ ان

قیدیوں کو کیا کرنا چاہیئے۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ ان سب کو رہا کر دیا جائے اس کا حماقت ہونا ظاہر ہے کہ دشمن کے ہزاروں لاکھوں کی تعداد کو پھر اپنے مقابلے کیلئے مستعد کر دیا۔ ایک صورت یہ ہے کہ سب کو فوراً قتل کر دیا جائے اگر اسلام میں ایسا کیا جاتا تو مخالفین جتنا شور وغل مسئلہ غلامی پر کرتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اس وقت کرتے کہ دیکھئے کہ کیا سخت حکم ہے کہ قیدیوں کو فوراً قتل کر دیا گیا۔ ایک صورت یہ ہے کہ سب کو کسی جیل خانے میں بند کر دیا جاوے اور وہاں رکھ کر انکو روٹی کپڑا دیا جاوے یہ صورت گو کہ آج کل کی بعض متمدن سلطنتوں میں پسندیدہ ہے مگر اس میں چند خرابیاں بھی ہیں ایک یہ کہ اس سے سلطنت پر بڑا بار عظیم پڑتا ہے اور ان سے کمائی کرنا خود غرضی کی صورت ہے۔ پھر جیل خانے کی حفاظت کے لئے ایک خاص فوج مقرر کرنا پڑتی ہے۔ قیدیوں کی ضروریات کے لئے بہت سے آدمی ملازم رکھے جاتے ہیں، یہ سارا عملہ بیکار ہو جاتا ہے۔ سلطنت کے کسی اور کام میں نہیں آسکتا قیدیوں ہی کی حفاظت کا ہو رہتا ہے۔

جیل میں رکھ کر راحت پہونچانا پھر تجربہ شاہد ہے کہ جیل خانے میں رکھکر آپ چاہے قیدیوں کو کتنی ہی راحت پہونچائیں ان کی ان کو کچھ قدر نہیں ہوتی کیونکہ آزادی سلب ہونے کا غیظ ان کو اس قدر ہوتا ہے کہ وہ آپ کی ساری خاطر مدارات کو بیکار سمجھتے ہیں تو سلطنت کا اتنا خرچ بھی ہوا اور سب بے سود کہ اس سے دشمن کی دشمنی میں کمی نہ آئے پھر قید خانے میں ہزاروں لاکھوں قیدی ہوتے ہیں وہ سب کے سب علمی اور تمدنی ترقی سے بالکل محروم رہتے ہیں اور یہ سب سے بڑا ظلم ہے۔ اسلام نے اس کے بجائے یہ حکم دیا کہ جتنے قیدی گرفتار ہوں سب لشکر والوں کو تقسیم کر دو، ایک گھر میں ایک غلام کا خرچ معلوم بھی نہ ہوگا۔ اور سلطنت بار عظیم سے بچ جائیگی، پھر چونکہ ہر شخص کو اپنے قیدی سے خدمت لینے کا حق بھی ہے اس لئے وہ اس کو روٹی کپڑا جو کچھ دیگا اس پر گراں نہ ہوگا۔ وہ سمجھے گا کہ میں تنخواہ دیکر نوکر رکھتا۔ جب بھی خرچ ہوتا اب اس سے خدمت لوں گا، اور اس سے معاوضہ میں روٹی کپڑا دوں گا۔ پھر چونکہ غلام کو چلنے پھرنے سیر و تفریح کرنے کی آزادی ہوتی ہے قید خانے میں بند نہیں ہوتا ہے اس لئے اس کو اپنے آقا پر غیظ نہیں ہوتا جو جیلخانے کے قیدی کو ہوتا ہے۔ اس حالت میں اگر آقا نے اس کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اسکا احسان دل میں گھر کر لیتا ہے اور وہ اس کے گھر کو اپنا گھر اس کے گھر والوں کو اپنا عزیز سمجھنے لگتا ہے۔

یہ سب باتیں ہی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ پھر اس صورت میں غلام علمی اور تمدّنی ترقی بھی تو کر سکتا ہے۔ کیوں کہ جب آقا غلام میں اتحاد ہو جاتا ہے تو آقا خود چاہتا ہے کہ میرا غلام مہذب و شائستہ ہو، وہ اس کو تعلیم بھی دلاتا ہے، صنعت و حرفت بھی سکھاتا ہے چنانچہ اسلام میں صدہا علماء زہاد عباد ایسے ہوئے ہیں جو اصل میں موالی[1] تھے۔ غلاموں کے طبقہ نے تمام علوم میں ترقی حاصل کی بلکہ غلاموں کو بعض دفعہ بادشاہت بھی نصیب ہوتی ہے۔

محمود غزنوی کا ایک واقعہ سلطان محمود رحمۃ اللہ علیہ کو مخالفین بہت بدنام کرتے ہیں کہ انھوں نے تلوار سے اسلام پھیلایا ہے۔ مگر تاریخ میں ان کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ اس سے ان کی رحم دلی اور شفقت کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ کہ غلاموں کے ساتھ ان کا کیا برتاؤ تھا۔ ایک بار سلطان محمود نے ہندوستان پر حملہ کیا اور بہت سے ہندو قید ہوئے جن کو اپنے ساتھ غزنی لے گئے ان میں ایک غلام بہت ہونہار و ہوشیار تھا، اس کو آزاد کر کے سلطان نے ہر قسم کے علوم و فنون کی تعلیم دی جب وہ تعلیم سے فارغ ہوا تو اس کو حکومت کے عہدے دیئے گئے حتیٰ کہ رفتہ رفتہ اس کو ایک بڑے ملک کا صوبیدار بنا دیا صوبہ دار کی حیثیت اس وقت وہ تھی جو آج کل کے بڑے والی ریاست کی حیثیت ہوتی ہے جس وقت سلطان نے اس کو تخت پر بٹھلایا اور تاج سر پر رکھا تو وہ غلام رونے لگا، سلطان نے فرمایا کہ یہ وقت خوشی کا ہے یا غم کا۔ اس نے عرض کیا جہاں پناہ اس وقت مجھے اپنے بچپن کا ایک واقعہ یاد آکر پھر اپنی یہ قدر و منزلت دیکھ کر رونا آگیا۔ حضور میں جسوقت ہندوستان میں بچہ تھا آپ کے حملات سنکر ہندو کانپتے تھے اور ان کی عورتیں اپنے بچوں کو آپ کا نام لیکر ڈرایا کرتی تھیں جیسا ہوا سے ڈرایا کرتی ہیں۔ میری ماں بھی مجھے اسی طرح آپ کے نام سے ڈرایا کرتی تھیں میں سمجھتا تھا کہ نہ معلوم محمود کیسا ظالم و جابر ہوگا حتیٰ کہ آپ نے خود ہمارے ملک پر حملہ کیا اور اس فوج سے آپکا مقابلہ ہوا جس میں یہ غلام موجود تھا۔ اس وقت تک میں آپ کے نام سے بھی ڈرتا تھا۔ پھر میں آپ کے ہاتھوں قیدی ہوا۔ تو میری جان ہی نکل گئی کہ بس اب خیر نہیں۔ مگر حضور نے دشمنوں کی روایات کے خلاف میرے ساتھ نیک برتاؤ فرمایا کہ آج میرے سر پر تاج سلطنت رکھا جا رہا ہے تو اس وقت میں خیال کر کے رونے لگا کہ کاش آج میری ماں ہوتی تو میں اس سے کہتا کہ دیکھ یہ وہی محمود ہے جس کو ہوا تبلایا کرتی تھی

---

[1] آزاد کردہ غلام۔

غلامی کا کرشمہ:۔ ایسے واقعات اسلام میں بکثرت ہیں اور یہ اسی مسئلہ غلامی کا نتیجہ ہے اگر یہ لوگ قید خانہ میں قید کر دیئے جاتے تو نہ ان کو مسلمانوں سے انس ہوتا نہ مسلمانوں کو ان سے تعلق ہوتا۔ غلام بن کر یہ لوگ مسلمانوں میں ملے جلے رہے۔ علمی ترقی حاصل کرتے رہے آخر کار اپنی حیثیت کے موافق درجات و مناصب پر فائز ہوتے رہے۔ کوئی محدّث بنا۔ کوئی فقیہہ، کوئی قاری بنا۔ کوئی مفسر کوئی نحوی بنا، کوئی ادیب، کوئی قاضی ہوا، کوئی حاکم ۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے غلامی کی نہایت رعائت فرمائی کہ آپ کا حکم ہے جو خود کھاؤ۔ جو خود پہنو وہی پہناؤ۔ اور جب وہ کھانا پکا کر لائے تو اس کو اپنے ساتھ بٹھلا کر کھلاؤ۔ عین وصال کے وقت میں آپؐ کی آخری وصیت یہ تھی۔ الصّلوٰۃ وَمَا مَلَکَتْ اَیمانُکُم یعنی نماز کا خیال رکھو اور ان غلاموں کا بھی جو تمہارے ہاتھوں کے نیچے ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا رعایت ہو سکتی ہے۔ اور الحمد اللہ حضرات صحابہؓ و تابعین اور اکثر سلاطین اسلام نے غلاموں کے ساتھ یہی برتاؤ کیا ہے اگر کسی ایک دو نے اس کے خلاف عملدرآمد کیا تو وہ اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے اس پر اسلام سے اعتراض نہیں ہو سکتا۔ ایضاً ص۵

اسلامی تعزیرات پر اعتراض اور اس کا جواب

آج کل متمدن اقوام نے قصاص بالسیف کی جگہ پھانسی تجویز کی ہے یہ بھی سخت موذی ہے کیونکہ اس میں روح نکلنے کے لئے کوئی راستہ نہیں ہوتا اور قتل میں جان نکلنے کا راستہ ہو جاتا ہے پھانسی میں تڑپنے کی وجہ سے زبان باہر نکل آتی ہے۔ اور صورت بگڑ جاتی ہے اور ان سے زیادہ متمدن اقوام نے ایک برقی کرسی تجویز کی ہے جس پر بیٹھے ہی ایک سکنڈ میں جان نکل جاتی ہے نہ معلوم اس میں کیسی کشش ہو گی اور روح پر کیا گذرتی ہو گی۔ مگر چونکہ دیکھنے والوں کو اس تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اس لئے یوں سمجھتے ہیں کہ اسمیں تکلیف نہیں اور قتل میں لاش کے تڑپنے اور سر کٹنے، خون بہنے کا منظر سامنے ہوتا ہے اس لئے اس کو وحشی سزا سمجھتے ہیں حالانکہ یہ بالکل غلط ہے ہاں یوں کہو کہ تم نے اپنی رعایت کر لی تمہارے سامنے بھیانک منظر نہ ہوا اور اس سے قیاس کر لیا کہ جب میرے سامنے بھیانک منظر نہیں تو واقع میں بھی کچھ تکلیف نہیں مگر یہ قیاس الغائب علی الشاہد ہے اور یہی اصل ہے تمام مغیبات کے انکار کی جو چیز نظر سے غائب ہے وہ ان کے نزدیک معدوم محض ہے۔

انہوں نے عدم مشاہدہ کو عدم ا[illegible] کی دلیل بنا لیا ہے، حالانکہ امریکہ کا مشاہدہ پہلے ایک عرصہ تک نہ ہوا تھا تو کیا وہ اس وقت بھی معدوم اصلی تھا؟ اور اس کا بطلان ظاہر ہے تو اب اس سوال کے کیا معنی کہ جنت دوزخ اگر کوئی چیز ہے تو وہ ہم کو نظر کیوں نہیں آتی تم کو نظر نہ آنے سے یہ کیونکر لازم آیا کہ وہ معدوم ہیں اسی طرح تم کو اگر پھانسی یا برقی کرسی کی سزا میں تکلیف کا منظر نظر نہیں آتا تو اس سے یہ کیونکر لازم آیا کہ مرنے والے کو بھی تکلیف زیادہ نہیں ہوئی، دلیل عقلی کا مقتضیٰ تو یہ ہے کہ قتل میں مرنے والے کو کم تکلیف ہوتی ہے۔ اور ان مہذب سزاؤں میں زیادہ تکلیف ہوتی ہے کیونکہ موت نام ہے زہوق روح یعنی جان نکلنے کا اور جن طریق میں جان نکلنے کا راستہ پیدا کیا جائے یقیناً اس میں سہولت سے جان نکلے گی۔ اور جن صورتوں میں گھونٹ کر دبا کر جان نکالی جائے گی، ان میں سخت تکلیف سے جان نکلے گی۔ گو دیر کم لگے گی۔

شریعت کی قدر و قیمت یہاں سے شریعت کی قدر ہوتی ہے کہ اس نے مجرم کیساتھ بھی احسان کیا ہے اور اس کی آسانی کی رعایت کی ہے کہ تلوار سے قصاص کا امر کیا ہے، رہا یہ کہ اس سے دیکھنے والوں کو وحشت ہوتی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ جس غرض کے لئے قصاص مشروع ہوا ہے یہ وحشت اس غرض سے تحصیل میں معین و مددگار ہے یعنی زجر و تنبیہہ کہ اس منظر کو دیکھ کر ہر شخص خائف ہو جائے اور جرائم پر اقدام کرنے سے رک جائے اور جو صورتیں اہل تمدن نے تجویز کی ہیں اس سے دوسرے کو زجر و تنبیہہ زیادہ نہیں ہوتی کیونکہ وحشت ناک منظر سامنے نہیں آتا۔ البتہ مجرم کو سخت تکلیف ہوتی ہے۔ اور یہ سخت بے رحمی ہے جب ایک شخص کو جان ہی سے مارنا ہے، تو اس کو راحت دیکر مارنا چاہیئے۔

حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم عام فرمایا ہے۔ اذا قتلتم فاحسنوا القتل اذا ذبحتم فاحسنوا الذبح جس میں قصاص کی بھی تخصیص نہیں بلکہ قتل کفار کو اور ذبح حیوانات کو بھی عام ہے۔ پس شریعت نے ظالموں کی بھی رعایت کی ہے کہ ان کو بے رحمی اور بے دردی سے نہ مارا جائے اور دوسروں کی بھی رعایت کی ہے دوسروں کی رعایت قصاص میں یہ ہے کہ ولکم فی القصاص حیٰوۃ یا اولی الالباب لعلکم تتقون کہ قصاص میں لوگوں کو جرائم سے زجر کامل ہوتا ہے۔ (افتاء المحبوب ص۷)

کیا جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں ہے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں محض تخویف و ترغیب کے لئے یہ نام بیان کئے گئے ہیں۔ نعوذ باللہ، ان لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن میں جتنی وعیدیں چوری، زنا، ظلم و ستم، کفر و معصیت پر ہیں یہ سب ایسی ہیں جیسے بچوں کو ڈرایا جاتا ہے کہ چپ رہو۔ ہوا آجائے گا ایسے جتنے انعامات جنت وغیرہ بیان کئے گئے ہیں یہ بھی محض بھسلایا ہے جیسا کہ بچوں کو بھسلایا کرتے ہیں میں ان لوگوں سے جواب میں کہتا ہوں کہ اول تو یہ بات ادنیٰ حاکم کے کلام میں ہونا بھی سخت عیب ہے چہ جائیکہ احکم الحاکمین کے کلام میں ہو، کیونکہ اس کو تو جھوٹ موٹ بہلانا بولتے ہیں اور خدا جھوٹ سے بالکل بری ہے۔ تعالیٰ اللہ عن ذالک الخ ص۴۰

لیکن اگر تسلیم بھی کرلیا جائے کہ جنت و دوزخ محض ترغیب و ترہیب کے لئے ہے اور واقع میں کچھ بھی نہیں تو رغبت و رہبت اسی وقت تک ہوسکتی ہے جب تک کہ مخاطب کو یہ راز معلوم نہ ہو کہ کیونکہ ظاہر ہے بعد اصل حال معلوم ہوجانے کے کہ یہ ترغیب و ترہیب ایک غیر واقعی امر ہے رغبت شوق و رہبت بالکل نہیں رہ سکتی پھر ان لوگوں کا اس امر کے معلوم ہونے کا دعویٰ کرنا کہ جنت و دوزخ کوئی چیز نہیں سراپا غلط ہے۔ غرض اول تو اس کے خلاف جاننے سے معاذ اللہ کلام اللہ پر لغویت کا دھبہ آتا ہے، جس کو کلامِ الٰہی کے لئے ہرگز گوارا نہیں کرسکتا پھر جو مقصود شارع کو ان وعیدوں اور ان کاموں کے بیان کرنے سے ہے کہ لوگوں کو مکلّف و مقید بنایا جائے اس صورت میں ہرگز نہیں حاصل ہو سکتا ایسا شخص جس کا ان وعیدوں کے بارے میں ایسا خیال ہے کہ یہ غیر واقعی ہیں یقیناً ارتکاب جرائم میں دلیر ہوگا۔ اوّل تو یہ سب کے سامنے جو چاہے گا کرے گا۔ اگر سامنے کرنے میں کسی کا پاس و لحاظ ہوا تو تنہائی میں تو بالکل نہ چوکے گا۔ مثلاً فرض کرو کہ ایک شخص اس خیال کا جنگل میں ہے اور وہاں ایک دوسرے شخص بھی موجود ہے سوائے ان دو شخصوں کے وہاں کوئی موجود نہیں، نہ پولیس چوکی اور پہرہ، اب فرض کرلو کہ اتفاق سے اس دوسرے کی شخص کی موت آگئی اور اس کے پاس ایک لاکھ روپیہ کا نوٹ ہے اور اس کے کاغذات سے اس کا پتہ بھی معلوم کرلیا کہ فلاں خاندان کا اور فلاں شہر کا باشندہ ہے اور یہ بھی اسے خبر ہے کہ اس کا وارث ایک یتیم بچہ ہے یہ سب کچھ ہے مگر اس واقعہ کو کسی کو خبر نہیں کہ یہ شخص کہاں مرا اور اس کے پاس

مرتے وقت کیا سامان تھا نہ کوئی دعویٰ کرسکتا ہے نہ مقدمہ چل سکتا ہے بتلایئے ایسی حالت میں یتیم بچہ تک روپیہ پہنچا دینے پر کوئی خوف اس شخص کو بجز خوف خدا عذاب آخرت کے مجبور کرسکتی ہے۔ اور کیا ایسا شخص جو وعید الٰہی کو محض تخویف سمجھتا ہے اس روپے کو اصل وارث تک پہونچا دے گا۔ بالخصوص ایسی صورت میں کہ اس روپے کی حاجت بھی ہو۔ یہ اسی شخص کا کام ہے جو خدا کے تمام وعدے وعید کو حق سمجھتا ہے اور اس کے دل میں عذاب آخرت کا خوف ہے، اس گندے عقیدے سے جہاں مصالح شرعیہ برباد ہوتی ہیں مصالح تمدنیہ بھی بالکل فوت ہوئے جاتے ہیں، اب آپ کو معلوم ہوگیا کہ تمدن کے لئے مذہب کی کس قدر ضرورت ہے صرف حکومت سے تمدن ہرگز قائم نہیں ہوسکتا کیوں کہ حکومت کا زور محض ظاہر تک منحصر ہے۔ دل میں شائستہ اخلاق مذہب ہی سے پیدا ہوسکتے ہیں۔ مجھے سخت حیرت ہے کہ تمدن کے مدعی مذہب کی ضرورت سے کیوں ناواقف ہیں۔ اگر کوئی ضروری چیز ہے تو مذہب اس سے پہلے ضروری ہوگا، مذہب کی ضرورت نہ مان کر کوئی تمدن قائم کرنا چاہے تو ناممکن ہے۔ دعویٰ تمدن کے بعد مذہب سے لاپرواہی کرنا ایسا ہی ہے کہ ؎

یکے بر سر شاخ دین می برید　　　خداوند بستان نگہ کرد و دید

تو یہ لوگ جس تمدن کی شاخ پر بیٹھے ہوئے ہیں اسی کی جڑ کوٹ رہے ہیں۔ پس عجیب بات ہے کہ قول سے تو ضرورت تمدن ثابت کی جاتی ہے اور فعل سے اس کی نفی کی جاتی ہے۔ غرض آپ کو معلوم ہوگیا ہوگا کہ جنت و دوزخ دینی چیزیں ہیں۔

(وعظ شعب الایمان ص۱۰۸)

مسلمان کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خدا تعالیٰ کے برابر سمجھتے ہیں؟

جواب :۔ شاید کسی مخالف کو یہ شبہ ہو کہ کیا مسلمان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خدائے تعالےٰ کے برابر ہیں تو ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ عبادت میں مسلمانوں کے نزدیک خدا کا کوئی شریک نہیں حصہ دار بھی اس میں شریک نہیں ہیں۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو سجدہ کرنا نہ ان کی زندگی میں جائز تھا نہ اب آپ کی قبر کو سجدہ جائز ہے مگر اطاعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ہے نہ اس لئے کہ آپ شریک فی الاطاعت ہیں، بلکہ اس لئے کہ آپ جو کچھ فرماتے ہیں وہ سب خدا کی طرف سے پیغام ہوتا ہے تو آپ کا حکم درحقیقت آپ کا حکم نہیں بلکہ پیغمبر ہونیکی

وجہ سے وہ خدا ہی کا حکم ہے اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ آپ کے احکام کی اطاعت خدا کے احکام کی اطاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ صـ۴۴ الخ۔
اور اس کی ایسی مثال ہے جیسے بادشاہ وزیر کو حکم دیتا ہے کہ رعایا میں یہ قانون شائع کر دو۔ پس اس وقت وزیر کی زبان سے جو قانون شائع ہو رہا ہے وہ درحقیقت بادشاہ کا حکم ہے اس لئے وزیر کی اطاعت بعینہ بادشاہ کی اطاعت ہے مگر اس سے ہرگز کوئی شخص یہ نہیں سمجھتا کہ وزیر بادشاہ کے برابر ہو گیا۔ اور اگر کوئی شخص ایسا سمجھنے لگے اور آئندہ سے بجائے بادشاہ کے تخت کو بوسہ دینے کے وزیر کی کرسی کو بوسہ دینے لگے تو یقیناً وہ معتوب ہو گا، اسی طرح اگر آپ کسی مقدمہ میں ایک شخص کو وکیل کر دیں تو جو کچھ وہ کرتا ہے سب آپ کی طرف منسوب ہوتا ہے کہ گویا تم خود کہہ رہے ہو مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وکیل تمہارے برابر ہو گیا کہ تمہاری جائداد کا مالک ہو جاوے کہ اس میں جو چاہے تصرف کرے ہرگز نہیں۔ پس مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کو خدا کی اطاعت اسی معنیٰ کر کہتے ہیں جیسے وزیر کی اطاعت بادشاہ کی اطاعت ہوتی ہے۔ اور وکیل کا قول موکل کا قول ہوتا ہے خوب سمجھ لو کہ اس سے شرک و مساوات ہرگز لازم نہیں آتی مگر افسوس یہ ہے کہ مخالفین اعتراض کرتے ہوئے مسائل اسلامیہ کی حقیقت کو ذرا نہیں سمجھتے ہیں اور اگر سمجھتے ہیں تو منشار اعتراض کا محض حسد ہے ورنہ مسائلِ اسلامیہ پر کوئی اعتراض بھی وارد نہیں ہو سکتا۔ (محاسن اسلام صـ۲)

(۱۱) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اشاعتِ اسلام سے مقصود کیا اپنی تعظیم ہے؟

جواب:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اشاعتِ اسلام سے اپنی تعظیم کرانا نہ تھا۔ کیونکہ جو شخص بڑا بننا چاہتا ہے وہ تو خود اس کی کوشش کرتا ہے کہ لوگ میرے سامنے جھکیں۔ مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت کہ لوگ آپؐ کو سجدہ کرنا چاہتے تھے اور آپ نے ان کو اس سے منع کیا اور صرف منع ہی نہیں کیا بلکہ اپنا فانی ہونا اس پر ظاہر فرما دیا۔ مگر پھر بھی بعض جہلار کفر کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ اعتراض ہے کہ نعوذ باللہ آپ بڑا بننا چاہتے تھے اور دلیل میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حج کے موقع پر ایک صحابی کو اپنا موئے مبارک دیئے تھے کہ مسلمانوں میں ان کو تقسیم کر دو اس پر وہ جاہل لکھتا ہے کہ دیکھئے

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال اس لئے تقسیم کرائے تاکہ لوگ اس کو تبرک سمجھ کر تعظیم سے رکھیں تو گویا آپ نے بڑا بننا چاہا۔ استغفر اللہ یہ آج کل کی فہم و عقل ہے افسوس اس شخص کو عبادت و محبت کے مستغنے میں بھی فرق معلوم نہیں، واقعی کفار کو محبت و عشق کا چسکا نہیں لگا۔ اسی واسطے وہ ایسے واقعات کی حقیقت نہیں سمجھتے جی تو یہ چاہتا ہے کہ ان لوگوں کو جواب بھی نہ دیا جائے۔ اور یہ کہدیا جائے۔

با مدعی بگوئید اسرار عشق و مستی	بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

محبت رسول کا حال

مگر میں تبرعاً اس کا جواب دیتا ہوں تاکہ کسی مسلمان کو اس اعتراض سے شبہ ہو تو وہ اس جواب سے تسلی حاصل کر سکے، بات یہ ہے کہ سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بال کن لوگوں میں تقسیم کرائے تھے، آپؐ نے اُن لوگوں میں بال تقسیم کرائے تھے جن کی محبت کی یہ حالت تھی کہ جب آپؐ وضو کرتے تھے تو وضو کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے۔ بلکہ آپ کا تھوک اور سارا وضو کا پانی اپنے ہاتھوں میں لے لیتے تھے۔ منہ کو ملتے آنکھوں سے لگاتے تھے اور ہر شخص اس کی کوشش کرتا تھا کہ سب سے پہلے آپؐ کے وضو کا پانی اور آپؐ کا تھوک میرے ہاتھوں میں آئے۔ چنانچہ اس کی کوشش میں ایک دوسرے پر گر پڑتا تھا اور ان کی محبت کا یہ حال تھا کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پچھنے لگوائے اور اس کا خون ایک صحابی کو دیا کہ اس کو کسی جگہ احتیاط سے دفن کر دو۔ صحابی کی محبت نے گوارا نہ کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا خون زمین دفن کیا جائے انھوں نے الگ جا کر اسے خود پی لیا۔ اس پر یہ اعتراض نہ کیا جائے کہ (نعوذ باللہ) صحابی بہت ہی بےحس تھے کہ تھوک ملتے ہوئے اور خون پیتے ہوئے گھن نہ آتی تھی۔ بات یہ ہے کہ ان امور کا تعلق عشق و محبت سے ہے۔ اور اس کی حقیقت عاشق ہی سمجھ سکتا ہے جس کا مذاق یہ ہے۔ ؎

غیرت آں چشم برم روئے تو دیدن ندہم	گوش را نیز حدیث تو شنیدن ندہم

محبت کا اثر

صاحبو! اگر آپ کو بھی کسی سے عشق ہوا ہو تو آپ کو معلوم ہوا ہو گا کہ عاشق بعض دفعہ محبوب کی زبان اپنے منہ میں لے کر چوستا ہے اور عشاق لعاب دہن محبوب کی مدح میں دفتر کے دفتر اشعار میں لکھ جاتے ہیں تو کیا یہ بےحس ہیں ہرگز نہیں اگر یہ بےحس ہیں تو سمجھئے کہ ساری دنیا بےحس ہے کیونکہ محبت میں ہر شخص یہی کرتا ہے کوئی

عاشق اس سے بچا ہوا نہیں اسی طرح اگر کسی کے محبوب کے بدن میں خون بہنے تو عشاق اس جگہ منہ لگا کر خون چوستے ہیں تاکہ محبوب کے بدن میں خون بہنے لگے تو عشاق اس جگہ منہ لگا کر خون چوستے ہیں تاکہ محبوب کو زخم کی تکلیف کا احساس نہ ہو یا کم ہو جائے۔ معلوم ہوا کہ خون چوسنا بھی کوئی گھن کی بات نہیں عاشق کو اس سے جو حظ ہوتا ہے اس کے دل سے پوچھنا چاہیئے پھر جب ادنیٰ ادنیٰ محبوب کا لعاب دہن اور خون گھن کی چیز نہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھوک اور پسینہ اور خون کیونکر گھن کی چیز ہو سکتا ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت تھی کہ قدرتی طور پر آپؐ کا تمام بدن خوشبودار تھا آپ کے پسینے میں اس قدر خوشبو تھی کہ عطر کی خوشبو اس کے سامنے بے حقیقت تھی۔ آپ کا لعاب دہن نہایت خوشبودار اور شیریں تھا اور یہی حال آپ کے خون کا تھا تو ایسی چیز سے کون گھن کر سکتا ہے مگر کفار کو ان امور کی کہاں خبر نہ ان کو عشق و محبت کی ہوا لگی ہے نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت سے اطلاع ہے۔

صحابہ کا عشق رسولؐ

بہر حال صحابہؓ آپؐ کے ایسے عاشق تھے کہ وضو کا پانی زمین پر نہ گرنے دیتے تھے اور اس کو ہاتھوں ہاتھ لینے کے لئے ایک دوسرے پر گرتے پڑتے تھے تو ایسی جماعت سے کیا یہ امید تھی کہ وہ آپ کے بالوں کو زمین میں دفن ہونے دینگے کیونکہ یقیناً بال کا درجہ وضو کے پانی سے زیادہ تھا۔ اس کو محض جسم سے تلبس (ملاپ) ہوا تھا اور یہ تو بدن کا جزو ہے پس اگر آپؐ اپنے بالوں کو دفن کراتے تو یقیناً صحابہؓ زمین میں سے ان کو نکالنے کی کوشش کرتے۔ پھر اس میں ہر شخص یہ کوشش کرتا کہ میرے ہاتھ میں زیادہ بال آئیں تو ایک دوسرے پر گرتا اور عجب نہیں کہ قتال کی نوبت آجاتی اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح قتال سے صحابہؓ کو بچانے کیلئے اپنے بال خود ہی تقسیم کرا دیئے۔ اور دفن نہ کرا دئے، بتلایئے اب اس میں کیا اشکال ہے پس معلوم ہو گیا کہ آپ کا اپنے بال تقسیم کرانا اپنی تعظیم و عبادت کے لئے نہ تھا بلکہ صحابہؓ کی محبت پر نظر کرتے ہوئے ان کے نزاع و قتال کے رفع دفع کرنے کے لئے تھا اگر معاذاللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں ذرہ برابر بھی بڑائی و تکبر کا خیال ہوتا تو آپ عمدہ لباس پہنتے، مکان عمدہ بنانے، نفیس نفیس کھانے کھایا کرتے، آپؐ کے پاس خزانہ جمع ہوتا، مگر تاریخ شاہد ہے اور احادیث میں صحیح طریقے سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا لباس موٹا چھوٹا ہوتا تھا آپؐ کے مکانات سب کچے تھے آپؐ اپنے پاس کچھ بھی نہ رکھتے تھے۔

آنحضرتؐ کا طریقہ کار:- یہ نہیں کہ آپ کے پاس مال آتا نہ تھا نہیں۔ بعض جنگ میں اتنا مال آیا کہ اس کا شمار نہیں ہو سکتا تھا بکریوں سے جنگل کے جنگل بھر گئے تھے اور آپ نے وہ سب بکریاں ایک اعرابی کو اس کے سوال پر عطا فرما دیں اور اس قدر تھے کہ آپؐ نے کسی کو سو، کسی کو دو سو عنایت فرمائے۔ جب بحرین کا جزیہ آیا تو اتنا روپیہ تھا کہ مسجد کے اندر سونے کا ڈھیر لگ گیا۔ مگر آپؐ نے تھوڑی دیر میں سب کا سب صحابہ کرام کو تقسیم فرمایا اور اپنے واسطے ایک درہم بھی نہ رکھا تو کیا بڑائی چاہنے والا یہ گوارہ کر سکتا ہے کہ خود تو خالی ہاتھ رہے اور مخلوق کو مالا مال کر دے۔ پھر آپؐ کی یہ حالت تھی کہ راستہ میں جب چلتے تھے تو صحابہؓ کو اپنے سے آگے چلنے کا حکم کرتے تھے اور خود پیچھے چلتے، بعض دفعہ کوئی صحابہؓ سواری پر سوار ہوتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ پیدل چلتے، اور وہ اترنا چاہتے اور آپؐ منع فرماتے اکثر آپؐ اپنا سودا بازار سے خود لے آیا کرتے تھے۔ اگر کوئی شخص کسی کام میں آپؐ سے امداد لینا چاہتا تو آپؐ کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتا لے جاتا آپ اس کا کام کر دیتے تھے، گھر میں آکر آپؐ اپنے گھر کا کام بھی کرتے تھے، کبھی بکری کا دودھ خود نکال لیا کرتے تھے، کبھی جوتا اپنے ہاتھ سے گانٹھ لیا، کبھی آٹا گوندھ دیا۔ آپؐ بعض دفعہ زمین پر بیٹھ جاتے، بوریہ پر لیٹ جاتے تھے جس سے آپؐ کے پہلو پر نشان ہو جاتے، بعض دفعہ کسی یہودی کا آپ پر قرض ہوتا اور وہ تقاضہ کرنے میں سختی کرتا برا بھلا کہتا اور حضرات صحابہ کو یہودی پر غصہ آتا وہ اس کو دھمکانا چاہتے تو آپ صحابہؓ کو منع فرماتے اور یہ ارشاد فرماتے کہ صاحب کو کہنے سننے کا حق ہے۔

اس جاہل معترض سے کوئی پوچھے کیا بڑائی اور عظمت چاہنے والوں کے یہی حالات ہوا کرتے ہیں۔ افسوس کہ اس نے ایک بال تقسیم کرنے کا واقعہ لے لیا، اور ان تمام واقعات سے اندھا ہو گیا۔ سو میری تقریر سے معلوم ہو گیا کہ بال تقسیم کرنے کا واقعہ بھی بڑائی یا عظمت کے واسطے نہ تھا بلکہ اس میں وہی تمدن اور سیاسی مصلحت تھی جو میں نے ابھی ذکر کی۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بال تقسیم فرما کر قیامت تک کے لئے یہ بات بتلا دی کہ میں فانی ہوں اور بشر ہوں کیوں کہ بال متغیر و حادث ہیں کبھی وہ سر کے اوپر ہیں کبھی استرے سے مونڈ کر جدا کئے جاتے ہیں تو جو شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بالوں کو دیکھے گا (چنانچہ بعض جگہ بحمداللہ اب تک آپؐ کے بال محفوظ ہیں۔ اور لوگ ان کی زیارت کرتے ہیں)، تو وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فانی و بشر ہونے پر استدلال کرے گا اور سمجھ جائے گا کہ آپؐ انسان تھے خدا نہ تھے

تواس سے آپ ﷺ نے مسلمانوں کی توحید کو کامل فرمایا۔ نہ کہ اپنی عظمت و بڑائی چاہی۔ ع

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زوند، (ایضاً صہ۵۸)

نجات کیلئے صرف خدا پر ایمان لانا کافی الخ صہ۵۱

جواب:-

حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تعلق قطع کرنا مطلق سلب فیوض و کمالات کا سبب ہے اگر چہ گستاخی بھی نہ کرے یہاں سے ان لوگوں کی غلطی معلوم ہوگئی جو شخص توحید کو نجات کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ تصدیق رسالت کو ضروری نہیں سمجھتے، افسوس مسلمانوں میں بھی بعض لوگ ایسے پیدا ہوگئے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف توحید کی تعلیم کے لئے آئے تھے، تو جو شخص توحید کا اقرار کرے وہ نجات پائے گا۔ گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہ کرے۔ یاد رکھو یہ قول بالکل باطل ہے، نجات بدون تصدیق رسالت کے ہرگز نہیں ہوسکتی، جس طرح توحید رکن ایمان ہے، اسی طرح تصدیق رسالت بھی رکن ایمان ہے لوگوں نے اس آیت سے دھوکہ دینا چاہا ہے۔

ان الذین اٰمنوا الخ صہ۵۲ ۔

ترجمہ :- جو لوگ ایمان لائے اور جو لوگ یہودی اور نصرانی ہیں اور جو صابی ہیں (ان میں سے) جو کوئی بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے (قانون شریعت کے موافق) ایسوں کے لئے ان کے پروردگار کے پاس حق الخدمت بھی ہے، اور وہاں ان پر کسی طرح کا اندیشہ بھی نہیں۔ اور نہ وہ مغموم ہوں گے۔

اس آیت میں تصدیق رسالت کا ذکر (ظاہراً) نہیں ہے بلکہ سب فرقوں کی نجات کا مدار صرف ایمان و عمل و ایمان بالآخرت قرار دیا گیا ہے اس سے بعض لوگوں نے اس غلطی میں ڈالنا چاہا کہ نجات کے لئے تصدیق رسالت محمدیہ ﷺ کی ضرورت نہیں۔ جواب اس کا یہ ہے کہ ایمان باللہ و ایمان بالآخرت بغیر تصدیق رسالت محمدیہ کے متحقق ہی نہیں ہوسکتا پس یہ کہنا غلط ہے کہ یہاں تصدیق رسالت کا ذکر نہیں۔

ایک واقعہ

تفصیل اس سے جواب کی وہ ہے جو میں نے ایک ڈپٹی کلکٹر سے کہلا بھیجی تھی وہ بندۂ خدا بھی اس غلطی میں مبتلا تھے ویسے بڑے نیک پابند صوم و صلوٰۃ تھے، مگر شیطان نے ان کے دل میں یہ وسوسہ ڈال رکھا تھا کہ نجات کے لئے صرف ایمان باللہ کافی ہے تصدیق رسالت کی ضرورت نہیں۔ واقعی بدون علم دین کے کامل اصلاح نہیں ہوتی۔ عقائد بھی درست نہیں ہوتے۔ افسوس آج کل لوگوں نے انگریزی پڑھنے کو بھی علم سمجھ لیا ہے۔ پس وہ ایسا ہی علم ہے جس سے روپیہ پیسہ معلوم ہوجاتا ہے۔ خدا اس سے معلوم نہیں ہوسکتا۔ میں نے ڈپٹی صاحب کو کہلا کر بھیجا کہ ایمان باللہ کے صرف یہی معنی نہیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو موجود مانے کیونکہ وجود کا انکار مشرکین بھی نہیں کرتے بلکہ ایمان باللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صفات کمال سے متصف اور صفات نقص سے منزہ سمجھے ہیں اب میں کہتا ہوں کہ صفات کمال میں سے ایک صفت صدق بھی ہے جس کے ساتھ خدا کو موصوف ماننا توحید کے لئے ضروری ہے۔ اور صفات نقص میں سے ایک صفت کذب بھی ہے۔ جس سے خدائے تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازم ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے۔ تو اس خبر کو بھی سچا سمجھنا واجب ہے۔ پس جو آپ کو رسول نہیں مانتا وہ خدا تعالیٰ کو کاذب کہتا تو پھر اللہ تعالیٰ پر کہاں ایمان لایا، پس ثابت ہوگیا کہ خدائے تعالیٰ پر ایمان لانا بدون تصدیق رسالت کے ممکن نہیں، میں نے یہ بھی کہلا بھیجا کہ جواب کے لئے دس سال کی مہلت ہے۔ اس دلیل کا ان کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ پھر خدا نے انکی اصلاح کردی بعد میں مجھ سے ملے بھی تھے اس وقت ان کا شبہہ بھی رفع ہوچکا تھا۔ بیچاروں کا خاتمہ اچھا ہوا۔ بس خوب سمجھ لو کہ بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے نجات ہرگز نہیں ہوسکتی۔

ایک فلسفی کا قصہ

ایک فلسفی کی بابت ایک شخص نے خواب دیکھا تھا۔ میں اس فلسفی کا نام بتلانا نہیں چاہتا خواہ مخواہ ایک مسلمان سے خواب کی بناء پر بدگمانی ہوجائے۔ مگر اس شخص کے خیالات تھے فلسفیانہ مگر ظاہر میں مسلمان کہلاتا تھا۔ خواب یہ تھا کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو زیارت نصیب ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ حضور ﷺ فلاں شخص کا کیا حال ہوا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ وہ بدون میرے توسل کے جنت میں جانا چاہتا تھا، مگر میں نے ہاتھ پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا کہ دور ہو کمبخت۔ جنت میں بغیر میرے تعلق کے کوئی نہیں جاسکتا۔ غرض آپ امت کے لئے واسطہ فی العروض ہیں تمام کمالات و فیوض میں

بدون آپ ﷺ کے واسطے کے کوئی شخص بھی کمالات بلکہ ایمان سے بھی موصوف نہیں ہو سکتا۔ اسی کو حضرت شیخ سعدیؒ فرماتے ہیں ؎

پندار سعدی کہ راہ صفا | تواں رفت جز بر پئے مصطفےٰ
خلاف پیمبر کسے رہ گزید | کہ ہرگز بمنزل نہ خواہد رسید

یہ تو ان کے واسطے ہے جو بدون حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے تعلق کے اس راستہ کو قطع کرنا چاہیں اور تعلق والوں کے واسطے انشاء اللہ یہ ہوگا۔

؎ نماز بعصیاں کسے در گرد | کہ دارد چنیں سید پیش رو

اور یہ ہوگا۔

طوبیٰ لنا معشر الاسلام ان لنا | من العنایۃ رکنا غیر منہدم

(وعظ الرفع والوضع ص۲۹)

تمہارے نبی کو معراج جسمانی ہوا ص۵۶

جو لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عروج صوری یعنی عروج آسمانی کا انکار کرتے ہیں اور اس معراج کو منامی (خواب) یا کشفی بتلاتے ہیں سو یہ بالکل نصوص کے خلاف ہے بلکہ احادیث مشہورہ سے آپ کا آسمان پر تشریف لے جانا ثابت ہے اور بیت المقدس تک تشریف لے جانا نص قرآنی سے ثابت ہے جس کا انکار بلا تاویل کفر ہے، اور بتاویل بدعت، ان منکرین معراج آسمانی کے پاس کچھ دلائل تو عقلی ہیں، کچھ نقلی، عقلی دلائل تو یہ ہے کہ اس سے افلاک میں خرق والتیام (پھٹنا اور ملنا) لازم آتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فلاسفہ کے پاس خرق والتیام پر کوئی دلیل نہیں اور جب وہ دلائل پیش کریں گے تو اس وقت انشاء اللہ ہم ان سب کا لغو اور باطل ہونا ظاہر کر دیں گے۔ چنانچہ متکلمین اس سے فارغ ہو چکے ہیں۔ دوسری دلیل یہ ہے کہ جسطرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج کا قصہ احادیث میں آتا ہے کہ آپ اتنی جلدی سیر سمٰوت سے فارغ ہو کر واپس آ گئے کہ صبح بھی نہ ہونے پائی تھی یہ محالات سے ہے کہ مکہ سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے بیت المقدس تک اور پھر وہاں سے ساتوں آسمان تک آپ سیر کرائیں اور یہ سارا قصہ ایک رات کے تھوڑے حصہ میں ہو جائے۔ ہم کہتے ہیں کہ اس میں استحالہ (محال ہونے) کی کیا بات ہے۔ وہاں استبعاد ہو سکتا ہے، سو وہ بھی

بطور الزام کے اس طرح مدفوع ہے کہ تمہارے نزدیک زمانہ حرکت فلک الافلاک کا نام ہے چنانچہ رات اور دن کا آنا طلوع وغروب کا ہونا یہ سب حرکت فلک (آسمان) سے مرتبط ہے اگر حرکت فلک موقوف ہو جائے تو جو وقت موجود ہوگا وہی رہے گا۔ اگر رات موجود ہوگی تو رات ہی رہے گی۔ دن موجود ہوگا تو دن ہی رہے گا۔ تو ممکن ہے کہ حق تعالیٰ نے اس رات حرکت فلک کو تھوڑی دیر کے لئے موقوف کر دیا ہو اور اس میں کچھ تعجب نہیں۔ معزز مہمان کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے دنیا میں بھی یہ قاعدہ ہے کہ جب بادشاہ کی سواری نکلتی ہے تو سڑک پر دوسروں کا چلنا بند کر دیا جاتا ہے۔ ہم جب حیدر آباد آ گئے تو ایک دن دیکھا کہ پولیس کے سپاہی لوگوں کو سڑک پر چلنے سے روک رہے ہیں اس وقت سڑک پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ نواب صاحب کی سواری نکلنے والی ہے اسی طرح حق تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے اگر آسمان اور چاند سورج سب کی حرکت کو اس رات کچھ دیر کے لئے بند کر دیا ہو کہ جو چیز جہاں ہے وہیں رہے بس آفتاب جس جگہ تھا وہیں رہا اور ستارے جہاں تھے وہیں رہے کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلنے نہ پایا۔ اس میں کیا تعجب ہے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم معراج سے فارغ ہو گئے۔ پھر فلک کو حرکت کی اجازت ہو گئی تو اب ظاہر ہے کہ حرکت فلک جس جگہ سے موقوف ہوئی تھی وہیں سے شروع ہوگی تو آپ کی سیر میں چاہے جتنا ہی وقت صرف ہوا ہو مگر دنیا والوں کے اعتبار سے سارا قصہ ایک ہی رات میں ہوا ہو۔ کیونکہ حرکت زمانہ اس وقت موقوف ہو چکی تھی۔ اب اگر کوئی دوام حرکت افلاک کا دعویٰ کرے تو وہ اس کے التزام کو ثابت کرے۔ انشاء اللہ ایک دلیل بھی قائم نہ کر سکے گا۔ دوسرا عاشقانہ جواب اس اشکال کا مولانا نظامی نے دیا ہے ؎

تن او کہ صافی تراز جان ماست | اگر آمد و شد بیک دم رواست

یعنی یہ بات سب کو معلوم ہے خیال انسان ذرا سی دیر میں بہت دور پہونچ جاتا ہے چنانچہ آپ اسی وقت عرش کا تصور کیجئے تو ایک منٹ سے بھی کم میں عرش پر خیال پہونچ جائے گا۔ خیال کی حرکت بہت سریع ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ خیال روح کی ایک قوت ہے۔ اور روح نہایت لطیف چیز ہے اور مادیات کی طرح کثیف نہیں اس لئے اس کی سیر میں کوئی حاجب مانع نہیں ہوتا۔ مولانا نظامی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بدن مبارک

تو ہمارے خیال سے بھی پاکیزہ تر ہے۔ جب خیال ذراسی دیر میں کہیں سے کہیں پہنچ جاتا ہے تو آپ کا جسم اطہر زمین سے آسمان تک اور وہاں سے عرش تک ذراسی دیر میں ہو آئے تو اسمیں تعجب کی کیا بات ہے ایک دلیل فلاسفہ پیش کیا کرتے ہیں کہ ہوا کے طبقہ سے اوپر جو خلاء ہے اسمیں ہوا نہ ہونیکی سبب کوئی متنفس زندہ نہیں رہ سکتا تو آپ اسمیں سے اگر گذرتے تو زندہ کیسے رہتے۔ مگر انہوں نے یہ دیکھا کہ بعد تسلیم اس استلزام کے یہ اس وقت ہے جب متنفس (سانس لینے والے) کو اس میں کچھ مکث (ٹھہراؤ) بھی ہو چنانچہ آگ کے اندر سے اگر جلدی جلدی ہاتھ کو نکالا جاوے تو آگ کا اثر نہیں ہوتا۔ پس اگر آپ نہایت سرعت کے ساتھ اس خلاء سے گذر جائیں تو وہ عدم تنفس میں موثر نہ ہوگا۔ اور دلیل نقلی ان منکرین کے پاس حضرت عائشہ رضی اللہ تعالے عنہا کا قول ہے۔ واللہ ما فقد جسد محمد صلی اللہ علیہ وسلم فی لیلۃ الاسرا۔ کہ بخدا شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم مفقود یعنی غائب نہیں ہوا۔ اس کا جواب لوگوں نے یہ دیا ہے کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کہاں تھیں۔ نیز اسوقت ان کی عمر بہت ہی کم تھی شاید چار پانچ سال کی ہو۔ اور اگر معراج ۵ھ نبوت میں ہوئی جیساکہ زہری کا قول ہے تو وہ اسی سال پیدا ہوئی ہونگی (جامع) اس لئے اجل صحابہ رض کی روایت اس واقعہ میں انکی روایت سے مقدم ہے مگر اس کا حاصل بظاہر یہ ہوا کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بے تحقیق ایک روایت فرمادی ہم حضرت عائشہ صدیقہ رض سے یہ گمان نہیں کرسکتے نہ کسی صاحب ادب کو ایسی جرات ہوسکتی۔ یہ ماناکہ اس وقت وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں موجود نہ تھیں اور کم سن بھی تھیں مگر جو بات وہ فرمارہی ہیں وہ تو عقل وبلوغ کے زمانے میں ان سے صادر ہوئی ہے اور ایسے وقت میں وہ بدون تحقیق کے کوئی بات نہیں فرما سکتیں یقیناً تحقیق کے بعد فرمارہی ہیں ہاں یہ ممکن ہے کہ کسی دوسرے واقعہ کی نسبت فرماتی ہوں کیونکہ معراج میں تعدد ہے تو پھر کچھ بھی مضائقہ نہیں۔ میرے ذہن میں اس کا جو جواب آیا۔ ہے وہ بہت لطیف ہے وہ یہ کہ فقدان کے دو معنی ہیں ایک تو چیز کا اپنی جگہ سے گم ہوجانا، ہٹ جانا۔ دوسرے تلاش کرنا۔ چنانچہ دوسرے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ قَالُوْا وَاَقْبَلُوْا عَلَيْهِمْ مَاذَا تَفْقِدُوْنَ یعنی برادران یوسف علیہ السلام نے متوجہ ہوکر ندا کرنے والوں سے کہا کہ تم کس چیز کو تلاش کرتے ہو۔ یہاں فقدان کے معنی طلب کے زیادہ ظاہر ہیں پس حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا

کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاش کیجاتی۔ یہ مطلب نہیں کہ آپ ساری رات اپنے گھر سے جدا ہی نہیں ہوئے وہیں رہے تاکہ اس سے منامی معراج یا کشفی پر استدلال کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ آپ گھر سے جدا تو ہوئے مگر زیادہ دیر نہیں لگی جس سے گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو۔ اور اگر فقدان کے وہی معنی لئے جائیں جو متبادر ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسم شب معراج میں گم نہیں ہوا تب بھی اس سے معراج کا روحانی یا منامی ہونا ثابت نہیں ہوتا کیونکہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر سے اس رات جدا نہیں ہوئے۔ کیونکہ فقدان فعل متعدی ہے نہ کی لازم اس کے معنی غیبت وانفصال کے نہیں بلکہ گم کرنے کے ہیں جس کے لئے ایک فاقد اور دوسرے کا مفقود ہونا ضروری ہے پس مطلب یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس رات کسی نے گھر سے غائب اور گم نہیں پایا اور یہ درست ہے کیونکہ آپ گھر والوں کے ساتھ گھر میں سوئے ہوئے تھے اور معراج ایسے وقت ہوئی کہ عادتاً لوگوں کے گہری نیند سونے کا وقت تھا۔ پھر جاگنے کے وقت سے آپ واپس تشریف لے آئے بلکہ خود آکر گھر والوں کو نماز صبح کے لئے جگایا تو ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے رات کو جاگ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو گھر میں نہ دیکھا ہو اور اتنی بات مقصود ہونے کے لئے ضروری ہے۔ قلت ولعل هذا الخ ص۶۱

غرض اس میں شک نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج جسمانی ہوئی اور آپ اس جسم سے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ اس کا انکار ہرگز نہیں ہوسکتا اور یقیناً یہ صورت عروج رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا بہت بڑا کمال ہے۔ (وعظ الرافع والوضع ص۳۳)

تمہارے نبی تارک لذات الخ ص۶۲

آج عیسائی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے نبی تارک لذات تھے اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے نبی تارک نہ تھے تبع شہوت تھے کہ نو نکاح کئے جس کا ناواقف مسلمان ان کے سامنے جھینپتے ہیں سو اگر ترک لذات لازم زہد ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کو ضرور ترک کرتے تاکہ مخالفین کو مسلمانوں پر اعتراض کا موقعہ نہ ہوتا جس اعتراض کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بے ادب گنوار نے ایک بے ادب عیسائی کے جواب میں بک دیا کہ پہلے تم یہ ثابت کرو کہ عیسیٰ علیہ السلام میں قوت مردانگی بھی تھی

اسی وقت ان کے ترک نکاح پر فخر کرنا۔ مگر یہ بھی سخت بے ادبی ہے۔ عیسیٰ السلام

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق عقیدہ

عیسیٰ علیہ السلام پر اس ضعف کا ہرگز شبہ نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ حدیث بخاری میں ہرقل کا قول مذکور ہے جس پر اجل صحابہؓ نے سکوت کیا جس سے تقریر ہوگئی۔ کذلک الرسل تبعث فی احساب قومنا۔ کہ انبیاء علیہم السلام اعلیٰ حسب میں مبعوث ہوتے ہیں۔ اور حسب کہتے ہیں کمالات ذاتیہ کو جس کو معلوم ہوا کہ انبیاء علیہ السلام تمام کمالات سے علی وجہ الکمال موصوف ہوتے ہیں۔ تاکہ کسی کو انکی اتباع عار نہ ہو اور ظاہر ہے کہ اگر آپ کسی شخص کی نسبت یہ سن لیں کہ وہ عنین ہے تو طبیعت کو اس سے نفرت و رکاوٹ ہوجاتی ہے اور وہ شخص فوراً نگاہوں سے گر جاتا ہے۔ مگر کچھ قاعدہ ہے کہ انسان کے ساتھ اعتقاد جب ہی ہوتا ہے جب کہ اس میں مواد تو سب موجود ہوں۔ پھر اس کے روکنے میں فرشتہ ہو اور اگر خالص ہو تو اعتقاد کم ہوجاتا ہے اس واسطے یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں حصوراً وارد ہے اس کے معنی مفسرین نے صبوراً لکھے ہیں۔ اور عنین کے ساتھ تفسیر کو منکر کہا ہے، (کذا فی الشفاء معللاً بان ھذہ نقیصۃ وعیب ولا تلیق بالانبیاء علیہم السلام) بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو روکنے والے ہیں چنانچہ سیر سے معلوم ہوا کہ یحییٰ علیہ السلام نے اخیر عمر میں نکاح کیا تھا۔ (کذا فی الشفاء) جس سے ان کے عنین ہونے کا شبہ بالکل زائل ہوگیا بلکہ معلوم ہوا کہ ایسے قوی مرد تھے کہ ان کی قوت مردانگی بڑھاپے میں باقی رہی۔ اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام آخر زمانے میں نازل ہوکر نکاح کریں گے حدیث میں آتا ہے۔ ویولد لہ کہ ان کے اولاد بھی ہوگی جس سے ان کے ضعف ہونے کا شبہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ معلوم ہوا کہ ان کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ ہزاروں برس فرشتوں میں رہ کر بھی طاقت کم نہ ہوئی۔ بلکہ اس سے تو بظاہر نظر ان کی قوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے مگر نصوص سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات میں تمام انبیاء علیہم السلام سے اکمل ہیں اس لئے یہ شبہ نہیں ہوسکتا۔ الغرض

ترک لذات زہد نہیں

الغرض ترک لذات لازمی زہد نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح نہ کرتے بلکہ تقلیل لذات زہد ہی میں داخل ہے۔ کیونکہ احادیث میں وارد ہے کہ صحابہؓ آپؐ کے اندر تیس[۳۰] مردوں اور بعض روایات میں چالیس مردوں کی قوت کا اندازہ کرتے تھے اور مرد کی قوت چار عورتوں کے لئے کافی ہے۔ اسی لئے شریعت نے چار

تک کرنے کی اجازت دی ہے اس اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی قوت تھی جو ایک سو بیس عورتیں کی اور دوسری روایت کے موافق ایک سو ساٹھ عورتوں کے لئے کافی تھی بلکہ شرح شفاء میں ابونعیم سے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ چالیس مرد جنت کے مردوں میں سے ہیں اور ان میں ہر مرد کی قوت حسب روایت ترمذی ستر مرد کے برابر ہوگی اور ایک روایت میں سو مردوں کے برابر آیا ہے تو ایک حساب سے آپ میں قریب تین ہزار مرد کے برابر اور ایک حساب سے چار ہزار مرد کے برابر قوت ہوئی۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نو پر صبر کرنا یہ کمال زہد تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا صبر وضبط

اور آپؐ اس پر بھی قادر تھے کہ بالکل صبر کرلیتے چنانچہ جوانی میں آپؐ نے پورا صبر کیا کہ پچیس سال کی عمر میں چالیس[۴۰] سال کی بیوہ عورت سے نکاح کیا۔ بھلا کنوار مرد ایسی عورت سے نکاح کرسکتا ہے جو اس کی ماں بن سکے ہرگز نہیں پس جوانی میں آپؐ کا چالیس سالہ عورت سے نکاح کرنا اور ساری جوانی اسی کے ساتھ بسر کردینا اس کی کافی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم متبع شہوات ہرگز نہ تھے بلکہ آپ اعلیٰ درجہ کے زاہد تھے مگر بڑھاپے میں آپ نے نو نکاح کئے تو ضرور آپؐ کے ان نکاحوں میں کوئی حکمت تھی۔

آپؐ کے نکاح کرنیکی حکمتیں

چنانچہ حکمتِ اوّل ایک حکمت تو وہ تھی جو بعض عارفین نے بیان کی ہے کہ منشار تکوین عالم محبت ہے جیسا کہ کنت کنزاً مخفیاً فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق سے معلوم ہوتا ہے گو یہ حدیث ان الفاظ سے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں مگر مضمون حدیث صحیح ہے جو حدیث ان اللہ جمیلٌ یحب الجمال۔ (اور اللہ تعالیٰ جمیل ہے جمال کو محبوب رکھتا ہے۔) سے ثابت ہے جس کی تقریر نکت ودقیقہ کے مضمون ہشتدہم میں اور کلید مثنوی دفتر اول میں قبول کردند خلیفہ ہدیہ را تحت شعر گنج مخفی بدر بیری جوش کردیں احقر نے کی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس محنت تکوین کا مظہر سب سے زیادہ وقاع ہے کہ اس میں بھی محض بواسطے وقاع کے سبب ہوجاتا ہے۔ تکوین ولد کا بدون کسی تدبیر خاص کے جیسے تکوین عالم میں محض محبت بواسطہ کلمہ کن کے سبب ہوگیا تکوین عالم کا بدون کسی خاص تدبیر کے پس عارف کو عورت کی تلبس میں یعنی جماع میں محبت کی تکوین کی تجلی کا مشاہدہ ہوتا ہے اس لئے

وہ نکاح کرتا ہے اور اسی لئے جماع کی اس کو دوسروں سے زیادہ رغبت ہوتی ہے اور حدیث حُبِّبَتْ من دنیاکم النساء کا مبنیٰ اسی راز کو بعض عارفین نے فرمایا ہے۔

امت کو بتانا تھا کہ عورتوں کے ساتھ کیسے رہنا چاہیئے

حکمت دوم :۔ دوسری حکمت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں یہ تھی کہ امت کو عورتوں کے ساتھ برتاؤ کرنیکا طریقہ معلوم ہوا اگر آپؐ نکاح نہ کرتے اور پھر عورتوں کے حقوق کی تعلیم دیتے تو اس کا زیادہ اثر نہ ہوتا۔ کسی کو شبہ ہوسکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تو خود نکاح کیا نہیں۔ اس لئے بلا تامل عورتوں کے اتنے حقوق بیان فرما دیئے نکاح کرلے تو شاید ان حقوق کا ادا کرنا مشکل ہوتا اور اب کسی کو یہ کہنے کا منہ نہیں۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت سے زیادہ نکاح کرکے دکھلا دیئے۔ اور سب کے حقوق ان خوبی سے ادا فرمائے کہ اس کی نظیر کوئی پیش نہیں کرسکتا۔ حقیقت میں بیبیوں کے حقوق ادا کرنا عقلمند کا کام ہے کیونکہ بیوی سے دو قسم کے تعلق ہوتے ہیں۔ ایک علاقہ حاکمیت و محکومیّت کا کہ مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت محکوم، دوسرا علاقہ محبیت و محبوبیت کا کہ مرد محب اور عورت محبوب ہوتی ہے علاقہ حکومت کے ساتھ علاقہ محبت کی رعایت کرنا بڑا دشوار ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا ہے کہ اگر محبّت کے حقوق ادا کرتے ہیں تو حکومت کے حقوق فوت ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ بیبیوں کے عاشق مشہور ہیں وہ اکثر ان کی غلامی ہی کرنے لگتے ہیں ان کی خاک حکومت نہیں ہوتی نہ بیوی پر کچھ رعب ہوتا ہے۔ اور جو لوگ حکومت کے حقوق ادا کرتے ہیں ان سے محبت کے حقوق فوت ہوجاتے ہیں دونوں کو جمع کرنا اور ہر ایک کے پورے حقوق ادا کرنا کہ بی بی پر رعب بھی ہو حکومت بھی ہو اس کے ساتھ اس کا دل بھی شوہر سے کھلا ہوا ہو۔ کہ بے تکلف ہنس بھی لے، بول بھی لے۔ مذاق بھی کرلے اور اس پر ناز بھی کرلے یہ انسان کامل کا کام ہے یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کرسکتے تھے یا وہ شخص کرسکتا ہے جو آپؐ کا کامل متبع ہو۔ چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضؓ کو یاد فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ آپؐ ان بڑھیا کو کیا یاد فرمایا کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اچھی بیوی آپ کو دیدی حدیث میں ہے۔ فغضب حتیٰ قلت والذی بعثك بالحق لا اذکرھا بعدھذا الا بخیر۔ یعنی آپؐ کو غصہ آگیا جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ڈر گئیں۔ اور بقسم عرض کیا کہ اب سے جب کبھی انکا ذکر کرونگی بھلائی سے کرونگی یہ حالت رعب کی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا پر تھی جن کو سب سے زیادہ ناز

تھا اور دوسری ازواج کی کیا حالت ہوگی۔ تو ناز برداری کے ساتھ رعب کا جمع کرنا سرسری نہیں۔

حکمت سوم

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند نکاح کرکے یہ بھی بتلادیا کہ جس کے چند بیبیاں ہوں اسے سب کے ساتھ کس طرح عدل کرنا چاہیئے خصوصاً اگر ایک ساتھ محبت زیادہ ہو اور دوسریوں سے کم ہو تو اس وقت اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے اسکی ترجیح ظاہر ہو بلکہ امور اختیاریہ میں برابری کا پورا خیال رکھے چنانچہ آپؐ نے یہ بھی کرکے دکھلادیا کہ باوجودیکہ آپؐ کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے سب سے زیادہ محبت تھی مگر عدل میں کبھی کبھی آپؐ نے فرق نہیں کیا۔ ان میں اور دوسری بیبیوں میں بلکہ ہمیشہ سب میں عدل کی پوری رعایت فرماتے تھے۔

دل کے میلان پر قابو نہیں ہوتا

دل کا ایک طرف زیادہ مائل ہونا یہ آپ کے اختیار سے باہر تھا۔ اس میں برابری کیسے کرتے اسی لئے فرمایا کرتے تھے۔ اللّٰھم ھذا قسمی فی ما املك فلا تلمنی فیما لا املك۔ اے اللہ یہ میری برابری ہے اس چیز میں جس پر مجھے قدرت ہے پس مجھ سے اس بات میں مواخذہ نہ کیا جائے جس پر مجھے قدرت نہیں اس میں میلان قلب ہی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف زیادہ تھا اور یہ بات آپؐ کی طرف سے نہ تھی بلکہ غیب کی طرف ایسے سامان کئے گئے کہ خواہ مخواہ آپؐ کے دل کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرف میلان ہو چنانچہ نکاح سے پہلے حق تعالیٰ نے خود ایک حریر کے کپڑے میں فرشتے کے ذریعہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصویر بھیجی کہ یہ آپ کی بی بی ہیں جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کھولا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی تصویر پر نظر پڑی اور وہاں یعنی عالم آخرت میں تصویر جائز اگر تم وہاں اپنا فوٹو کھنچواؤ گے تو ہم منع نہیں کریں گے۔ یہ معاملہ حق تعالیٰ نے کسی اور بی بی کے ساتھ نہیں کیا۔ دوسرے وحی میں یہ معاملہ تھا کہ کسی بیوی کے لحاف میں آپؐ پر وحی نہ آتی تھی بجز عائشہ رضی اللہ عنہا کے کہ ان کے لحاف میں بھی آپؐ ہوتے تو بے تکلف آتی تھی تو یہ باتیں تھیں جن کی وجہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ ہی نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی جانب زیادہ مائل فرما دیا پھر اس پر ان کی قدرتی ذہانت و فقاہت اور حسن سیرت سونے پر سہاگا تھا اصل وجوہ آپ کی محبت کے وہی تھے جو پہلے مذکور ہوئے کہ حق تعالیٰ کو بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ سب بیبیوں سے زیادہ محبت تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پھر کیوں محبت نہ ہوتی۔ مگر بایں ہمہ سوائے محبت قلبی کے ظاہری برتاؤ آپؐ کا سب کے ساتھ برابر تھا۔

حضرتِ عائشہ رضؓ سے آپکی شادی

پھر آپؐ نے جس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نکاح کیا ہے اس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی ۔ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی عمر نو سال کی تھی وہ بالکل بچّی تھیں اور بجز ان کے کوئی بی بی آپؐ کی کنواری نہ تھیں اس میں حکمت یہ تھی کہ آپ کو امت کو یہ دکھلانا تھا کہ جس شخص کی عمر زیادہ ہو اس کو کنواری بچی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیئے عموماً عادت یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرد کا برتاؤ اپنی عمر کے تقاضے کے موافق ہوا کرتا ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو ان کے بچپن کی عمر کا تقاضہ تھا ۔ ان کے بچپن کی پوری رعایت فرماتے تھے ۔

حبشیوں کا کھیل

چنانچہ ایک مرتبہ مسجد کے قریب میں حبشی لڑکے عید کے دن کھیل کود رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا کہ حبشیوں کا کھیل دیکھو گی انھوں نے خواہش ظاہر کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے پردہ کر کے دیر تک ان کو کھیل دکھلایا اور محض کہنے میں تو کھیل تھا ورنہ ورزش اگر اچھی نیت سے ہو تو عبادت ہے اور چونکہ ان کھیلنے والوں کو دیکھنے میں کوئی فتنہ نہ تھا ۔ اس لئے یہ بھی شبہ نہیں ہوسکتا کہ اجنبی مردوں کو کیسے دیکھا ۔ اور جب تک وہ خود ہی نہ ہٹ گئیں اس وقت تک آپ برابر کھڑے ہوکر ان کو کھیل دکھلاتے رہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بچپن کی وجہ سے گڑیوں (یہ نام کی گڑیاں تھیں تصویر نہ تھی) کے کھیل کا بہت شوق تھا اور محلہ کی لڑکیاں بھی ان کے پاس کھیلنے کے لئے آتی تھیں ۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو وہ لڑکیاں متفرق ہوجاتیں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جمع کر کے پھر لاتے کہ آؤ بھاگتی کیوں ہو ۔ جس طرح کھیلتی تھیں کھیلتی رہو ۔

بیوی کی رعایت

ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ مسابقت بھی کی کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے ۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہلکی پھلکی تھیں وہ آگے نکل گئیں کچھ عرصہ کے بعد آپؐ نے پھر مسابقت کی اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا بدن بھاری ہو چلا تھا اس مرتبہ آپؐ آگے نکل گئے تو آپؐ نے فرمایا یہ اس کا بدلہ ہے ۔ فرمائیے کنواری بچی کی دلجوئی اور دلداری اور اس جذبات اور کی رعایت بڑھاپے میں کوئی مرد اس طرح کر سکتا ہے جس طرح حضور ؐ نے کی ۔ حاشا وکلا ۔ بوڑھوں سے یہ بہت دشوار ہے ۔ مگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بڑھاپے میں

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے وہ برتاؤ کیا جو جوان شوہر کو جوان بی بی کے ساتھ کرنا چاہیئے بلکہ کوئی جوان بھی اتنا نہیں کر سکتا تھا جتنا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ کیا ۔

وقار کا بھوت

آج کل جو لوگ وقار وقار پکارتے ہیں یہ وقار تکبر کا پوٹلہ ہے ان لوگوں نے تکبر کا نام وقار رکھ لیا ہے ۔ یاد رکھو وقار کے خلاف وہ کام ہے جس میں دین پر بات آتی ہو اور جسمیں دینی مصلحت پر کوئی اثر نہ پہنچے محض اپنی عرفی سُبکی ہوتی ہے تو ایسا کام عین تواضع ہے ۔ آج کل جو لوگ وقار کا پوٹلہ بغل میں دبائے ہوئے ہیں وہ بیوی کے ساتھ دوڑنے کو خلاف وقار سمجھتے ہیں مگر وہ زبان سنبھالیں اور آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ کے ساتھ مسابقت کی ہے تو کیا معاذ اللہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کو بھی خلاف وقار سمجھتے ہیں ۔ ہرگز نہیں ۔ اور اگر کوئی ایسا کہے تو اسکے ایمان کی خیر نہیں یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فعل خلاف وقار نہ تھا ہاں تکبر کے خلاف ضرور تھا پس آج کل کے مدعیان متکبر نہیں ہیں تو ذرا وہ ہم کو بیوی کے ساتھ دوڑ کر دکھلائیں مگر ان سے قیامت تک ایسا نہ ہوگا ۔ ہاں جو شخص متکبر نہ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا متبع ہوگا وہ ضرور ایسا کر سکتا ہے اور بحمد اللہ ہم نے بھی اس سنت پر عمل کیا ہے ۔

حکمتِ چہارم

ایک حکمت یہ تھی کہ عورتوں کے متعلق جو خاص احکام ہیں ان میں عورت کا واسطہ ہونا زیادہ نافع اور موجب سہولت ہوسکتا ہے دوسری عورتوں کے لئے پھر وہ احکام جن امور کے متعلق ہیں ان میں عادات عورتوں کی مختلف ہوتی ہیں تو یہ نہایت مصلحت کی بات ہے کہ وہ وسائط متعدد ہوں تاکہ ہر قسم کے احکام سہولت سے ظاہر ہوسکیں اور ظاہر ہے کہ منکوحہ کے برابر کوئی بے تکلف واسطہ نہیں ہوسکتا ۔ غرض یہ حکمتیں تھیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد نکاحوں میں اور یہ بھی نمونے کے طور پر چند بیان کر دی گئی ہیں ورنہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جن کے بیان کو عمر طویل چاہیئے ان وجوہ سے آپؐ نے متعدد نکاح کئے ہیں ورنہ اگر آپ چاہتے تو بالکل صبر کر لیتے اور جس طرح پوری جوانی ایک چالیس سالہ بیوہ کے ساتھ آپؐ نے گذار دی بڑھاپے کو بھی ایک بیوہ کے ساتھ گذار سکتے تھے مگر آپؐ نے ان حکمتوں کی وجہ سے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے متعدد نکاح کئے جس سے یہ ثابت ہوگیا کہ ترک لذات زُہد کے لئے لازم نہیں بلکہ صرف تقلیل لذات کافی ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ترک نکاح ضرور

فرماتے ۔ (وعظ تقلیل الکلام صـ۳۲)

(۱۵) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مزاح فرمانا

حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزاح فرماتے تھے اس میں بھی حکمت تھی ایک تو تطییب[1] قلوب اصحاب تھی اور دوستوں کا دل خوش کرنا بھی عبادت ہے میں نے اپنے استاد مولانا فتح محمد صاحب سے سُنا ہے کہ ایک دفعہ وہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب کی خدمت میں دیر تک بیٹھے رہے اور باتیں کرتے رہے جب اٹھنے لگے تو حضرت نے عرض کیا کہ آج میں نے حضرت کا وقت بہت ضائع کیا حضرت کی عبادت میں خلل ڈالا ۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ کیا نفلیں پڑھنا ہی عبادت ہے دوستوں سے باتیں کرنا عبادت نہیں ؟ یہ تم نے کیا کہا کہ وقت ضائع کیا ؟ نہیں بلکہ یہ سارا وقت عبادت ہی میں گذرا ۔ اسی طرح حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ صبح کی نماز کے بعد بعض دفعہ مصلیٰ پر بیٹھے رہتے تھے اور اشراق کے وقت تک دوستوں سے باتیں کرتے تھے ۔ عامی تو یہ سمجھتا تھا کہ یہ وقت عبادت سے خالی گذرا ۔ مگر مولانا اس کو بھی عبادت میں مشغول سمجھتے تھے کیونکہ تطییبِ قلب مومن بھی عبادت ہے ۔ پس ایک حکمت تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں یہ تھی ۔

مزاح کی دوسری حکمت دوسری حکمت وہ تھی جو مجھے خواب میں بتلائی گئی ۔ میں نے شباب میں خواب دیکھا تھا کہ ملکہ وکٹوریہ ایک ایسی سواری میں سوار ہے جسمیں نہ انجن ہے نہ گھوڑا نہ بیل ، اس وقت تو میں اس سواری کی حقیقت کو نہیں سمجھا تھا مگر اب موٹر دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ وہ سواری لاری موٹر کی شکل میں تھی ۔ اور میں نے دیکھا کہ ملکہ کی سواری تھانہ بھون کی گلیوں سڑکوں میں پھر رہی ہے پھر تھوڑی دیر بعد میں نے اپنے کو بھی اس سواری میں سوار دیکھا اس وقت ملکہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے حقانیت اسلام میں کوئی شبہ نہیں صرف ایک بات کھٹکتی ہے اگر حل ہو جائے تو پھر اسلام کے حق ہونے میں مجھے کوئی اشکال نہ رہے گا ۔ میں نے کہا بیان کیجئے وہ شبہ کیا ہے ۔ کہا حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مزاح بھی فرماتے تھے (اور مزاح وقار کے خلاف ہے

[1] دلوں کا خوش کرنا ۔

اور نبی کے لئے وقار کا ہونا ضروری ہے یہ اشکال سلاطین ہی کے مذاق کے مناسب ہے کیونکہ وقار خودداری کا سب سے زیادہ اہتمام انہی کو ہوتا ہے) میں نے جواب دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح میں بڑی حکمت تھی وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رعب وجلال اس درجہ عطا فرمایا تھا کہ ہرقل وکسریٰ اپنے تخت پر بیٹھے ہوئے آپؐ کے نام سے تھراتے تھے (حدیث میں ہے نصرت بالرعب مسیرۃ شہر) کہ اللہ تعالیٰ نے میری مدد رعب سے بھی کی ہے جو ایک مہینہ کی مسافت تک پہونچا ہوا ہے یعنی اس مخلوق پر بھی آپ کا رعب طاری تھا جو بقدر ایک مہینہ کی مسافت کے آپؐ سے دور تھے پاس والوں کا تو کیا ذکر ۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو بڑی چیز ہیں ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلامان غلام کے نام سے بھی سلاطین کانپتے تھے جیسے حضرت عمرؓ ، حضرت خالد رضی اللہ عنہما وامثالہما) اور یہ معلوم ہے کہ حضورؐ صرف سلطان نہ تھے بلکہ رسول بھی تھے اور رسول کا کام یہ ہے کہ امت کی ظاہری وباطنی اصلاح کرے جس کے لئے افادہ واستفادہ کی ضرورت ہے اور افادہ اور استفادہ کی شرط یہ ہے کہ مستفیدین کا دل مربی سے کھلا ہوا ہو تا کہ وہ بے تکلف اپنی حالت کو ظاہر کر کے اصلاح کر سکیں اور جس قدر رعب وجلال خدا تعالیٰ نے آپ کو عطا فرمایا تھا وہ صحابہ رضؓ کو استفادہ سے مانع ہوتا ہے ۔ اس لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم گاہ گاہ مصلحت سے مزاح فرماتے تھے کہ صحابہؓ کے دل کھل جائیں اور وہ ہر وقت مرعوب رہ کر اپنے دل کی باتیں بیان کرنے سے نہ رکیں اور یہ مسلم نہیں کہ ہر مزاح خلاف وقار ہے ۔ خلاف وقار صرف وہ مزاح ہے جس میں کوئی مصلحت وحکمت نہ ہو اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاح سے آپؐ کے وقار وعظمت میں کمی نہ آتی تھی بلکہ اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ صحابہ رضؓ کے قلوب میں انشراح پیدا ہوتا اور وہ انقباض جاتا رہتا تھا جو غایت رعب کی وجہ سے قلوب میں عادۃً پیدا ہوتا ہے ۔ جس کا ثمرہ یہ تھا کہ قلوب میں آپؐ کی محبت جاگزیں ہوتی تھی اگر آپ مزاح نہ فرماتے تو صحابہ کے اوپر آپ کا خوف بھی غالب ہوتا محبت غالب نہ ہوتی اور جب سے آپ کی محبت غالب ہوئی ۔ تو آپؐ کے وقار میں کچھ بھی کمی نہ ہوئی بلکہ پہلے سے بھی زیادتی ہوگئی کیونکہ پہلے تو وقار وعظمت کا منشا صرف خوف تھا اب محبت وخوف دونوں مل کر کام کرنے لگے ۔

مزاح سے رعب کب کم ہوتا ہے اگر کوئی یوں کہے کہ مزاح سے تو خوف زائل ہو جاتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ

یہ وہاں ہوتا ہے جہاں مزاح کرنے والے میں شان رعب کم ہو اور وہ مزاح بکثرت کرے اور اگر شان رعب بہت زیادہ ہو جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بابت احادیث میں وارد ہے اور مزاح بھی بکثرت نہ ہو تو اس صورت میں مخاطب بے خوف نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مشاہدہ اس کی دلیل ہے اور احادیث سے معلوم ہو سکتا ہے کہ حضرات صحابہ رضؓ کے قلوب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کس درجہ تھی اور جب کبھی کسی بات میں آپؐ کو غصہ آ گیا ہے تو صحابہ کی کیا حالت ہوتی تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے قوی القلب شجاع بھی تھرا جاتے اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر عاجزانہ التجا کرنے لگتے تھے۔ اس جواب کے بعد ملکہ نے کہا کہ اب میرا اطمینان ہو گیا اور اب مجھے حقانیت اسلام میں کوئی شبہ نہیں رہا۔

(الحدود والقیود صہ ۹)

(۱۶) مرتد کا درجہ کافر اصلی سے کیوں بڑھا ہوا ہے

جواب :۔ ترک اسلام کی دو صورتیں ہیں ایک تو یہ کہ اول ہی سے اسلام قبول نہ کرے دوسرے یہ کہ بعد قبول کے ترک کر دے دونوں صورتوں میں یہی سزا ہے بلکہ دوسری صورت پہلی سے اشد ہے چنانچہ قوانین سلطنت میں باغی کی سزا ان لوگوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ . . . . جو پہلے ہی سے اس سلطنت کی رعایا نہیں ہے بلکہ کسی مخالف سلطنت کی رعایا ہیں ایسے لوگوں پر اگر کبھی غلبہ ہو جاتے تو ان کو غلام بنا لیتے ہیں یا احسان کر کے رہا کر دیتے ہیں یا عزت کے ساتھ نظر بند کر دیتے ہیں۔ مگر باغی کے لئے بجز قتل یا عبور دریائے شور کے کچھ سزا ہی نہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ رعایا بن کر باغی ہو جانے میں سلطنت کی زیادہ توہین ہے۔

ارتداد کا انجام اسی طرح اسلام لا کر مرتد ہو جانے میں اسلام کی سخت توہین ہے اور اس کی تعلیم کو دوسرے کی نظر میں حقیر کرنا ہے۔ دیکھئے ایک تو وہ شخص ہے جس سے کبھی آپ کی دوستی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ سے مخالف ہے اس کی مخالفت سے آپ کا اتنا ضرر نہیں ہوتا اور اگر وہ کبھی آپ کی مذمت وہجو کرے تو لوگوں کی نظروں میں اس کی کچھ وقعت نہیں ہوتی سب کہہ دیتے ہیں میاں اس کو تو ہمیشہ سے اس کے ساتھ عداوت رہی ہے دشمنی

میں ایسی باتیں کرتا ہے۔ اور ایک وہ شخص ہے جو سالہا سال سے آپ کا دوست رہا پھر کسی وقت مخالف بن گیا اس کی مخالفت سے بہت ضرر پہونچتا ہے اور وہ جو کچھ برائیاں آپ کی کرتا ہے لوگ اس پر توجہ کرتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے اس کا منشاء محض عداوت نہیں ہے اگر دشمن ہوتا ہے تو سالہا سال تک دوست کیوں بنتا، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو دوستی کے بعد فلاں شخص کے اترے پترے معلوم ہو گئے ہیں اسی لئے مخالف ہو گیا حالانکہ یہ ضروری نہیں کہ جو شخص دوستی کے بعد دشمن بنا ہو وہ اترے پترے معلوم کرنے کے بعد دشمن بنا ہو، ممکن ہو کہ اس نے دوستی بھی اس نیت سے کی ہو کہ لوگ دوستی کے زمانے میں مجھے اس کا رازدار سمجھ لیں گے تو مخالفت کی حالت میں جو کچھ کہونگا اسکو یہ سمجھ کر قبول کریں گے کہ یہ شخص رازدار رہ چکا ہے اسکو ضرور کچھ راز کی باتیں معلوم ہوئی ہیں اسلئے مخالف ہو گیا چنانچہ بعض یہود نے اسلام کے ساتھ ایسا برتاؤ کرنے کا ارادہ کیا تھا۔ وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنزِلَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوا آخِرَهُ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ۔ پس ہر چند کہ دوست کے دوست کی مخالفت میں یہ احتمال بھی ہے مگر (جامع) عادتاً لوگ دوستوں کی مخالفت میں عموماً جلدی متاثر ہوتے ہیں (اور اس احتمال پر نظر نہیں کرتے) اس لئے عقلاً و شرعاً و قانوناً وہ شخص بہت بڑا مجرم شمار ہوتا ہے جو موافقت کے بعد مخالفت کرے۔ اس لئے شریعت میں مرتد کے لئے دنیاوی سزا بھی سخت ہے اور عذاب آخرت بھی اشد ہے۔

(محاسن اسلام صہ ۱۹)

(۱۷) مسلمان کا اقدام علی الکبائر اور اس کی وجہ

اس کا جواب یہ ہے کہ اقدام جرائم اگر عقیدہ اسلام کا ثمرہ ہوتا تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جن لوگوں کو اسلام سے جتنا زیادہ تعلق ہے مثلاً علماء اتقیاء و صوفیاء ان میں یہ ثمرہ زیادہ ظاہر ہوتا کیونکہ قاعدہ ہے کہ مذہب کے ثمرات کا ظہور ان ہی لوگوں میں زیادہ ہوتا ہے جن کو مذہب سے زیادہ تعلق ہے۔ حالانکہ ہم دیکھتے ہیں اور کفار بھی اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ جن لوگوں کو اسلام سے تعلق زیادہ ہے وہ جرائم کا ارتکاب کلم تو کیا کرتے وہ شبہات سے بھی احتراز[1] کرتے ہیں۔

---

[1] بچنا۔

ایک مسلمان کا واقعہ

چنانچہ ہمارے ایک دوست کا جو کہ بی ، اے ، ہیں واقعہ ہے کہ وہ ایک بار ریل کا سفر کر رہے تھے ، ان کے پاس اسباب پندرہ سیر سے زیادہ تھا ۔ اسٹیشن پر تنگیٔ وقت کی وجہ سے وہ اس کو وزن نہ کرا سکے اس وقت تو جلدی میں سوار ہو گئے لیکن جب منزل مقصود پر اترے تو وہاں کے بابو سے جاکر اپنا واقعہ بیان کیا کہ میں جلدی میں اسباب کو وزن نہ کرا سکا اب آپ اس کو وزن کرلیں اور جو محصول میرے ذمہ ہو اس کو وصول کر لیجئے بابو نے انکار کیا کہ مجھکو فرصت نہیں تم ویسے ہی لے جاؤ ہم تم سے محصول نہیں لیتے ۔ انھوں نے کہا کہ صاحب آپ کو اس معافی کا کوئی حق نہیں کیونکہ آپ ریلوے کے مالک نہیں ہیں بلکہ ملازم ہیں آپ کو محصول مجھ سے لینا چاہیئے مگر اس نے پھر بھی انکار کیا تو یہ اسٹیشن ماسٹر کے پاس گئے اس نے بھی کہا کہ آپ بلا تکلف سامان لے جائیں ہم آپ سے محصول نہیں لیتے ۔ انھوں نے اس سے بھی کہا کہ آپ کو معافی کا کوئی حق نہیں ہے اس کے بعد اسٹیشن ماسٹر اور اس بابو میں انگریزی میں گفتگو ہونے لگی وہ یہ سمجھے کہ یہ مسافر انگریزی نہیں سمجھتا ہوگا کیونکہ ان کی صورت ملاؤں کی سی تھی ، غرض ان دونوں نے اس گفتگو میں یہ رائے قرار دی کہ یہ شراب پیئے ہوئے معلوم ہوتا ہے باوجود ہمارے انکار کے یہ محصول دینے پر اصرار کرتا ہے ، انھوں نے جواب دیا کہ صاحب میں نے شراب نہیں پی ہے بلکہ ہمارا مذہبی حکم ہے کہ کسی کا حق اپنے ذمہ نہ رکھو ، اس پر وہ دونوں بولے کہ ہم تو اس وقت اسباب وزن نہیں کر سکتے آخر یہ اسباب اٹھا کر پلیٹ فارم سے باہر لائے اور سوچنے لگے کہ یا اللہ تعالیٰ اب میں ریلوے کے اس حق سے کیسے سبکدوشی حاصل کروں آخر اللہ تعالیٰ نے امداد کی اور یہ بات دل میں ڈالی کہ جتنا اسباب زیادہ ہے اس کے محصول کے برابر ایک ٹکٹ اسی ریلوے کے کسی اسٹیشن کا لے کر چاک کر دیا جائے ۔ اس طرح ریلوے کا حق اس کو پہونچ جائے گا چنانچہ ایسا ہی کیا ۔

دیانت داری کا دوسرا واقعہ

میرے ایک اور دوست کا جو ڈپٹی کلکٹر بھی تھے واقعہ ہے کہ ان کا ایک بچہ ریل کے سفر میں ان کے ہمراہ تھا جس کا قد بہت کم تھا کہ دیکھنے میں دس سال کا معلوم ہوتا تھا مگر اس کی عمر تقریباً ۱۳ سال کی تھی اور ریلوے کے قاعدے سے اس عمر کے بچہ کا ٹکٹ پورا لینا ضروری ہے انھوں نے ٹکٹ لینا چاہا تو ساتھیوں نے بہت منع کیا کہ اس کو تیرے سال کا کون کہہ سکتا

ہے آپ آدھا ٹکٹ لے لیجئے کوئی کچھ نہیں کہے گا ۔ انھوں نے کہا کہ بندے کچھ نہ کہیں گے تو کیا حق تعالیٰ بھی باز پرس نہ فرمائیں گے ؟ کہ تم نے دوسروں کی چیز میں تھوڑی اجرت بدوں اس کی اجازت کے کیوں تصرف کیا ۔ غرض انھوں نے پورا ٹکٹ لیا اور ان کے ساتھی ان کو بے وقوف بناتے رہے مگر ع ۔

اوست دیوانہ کہ دیوانہ نشد

بھلا اس کی نظیر کوئی قوم بھی دکھلا سکتی ہے کہ ایک شخص کو ریل بابو اور اسٹیشن ماسٹر خود کہہ دے کہ تم بلا تکلف اسباب لے جاؤ ہم محصول نہیں لیتے اور وہ پھر بھی اس پر اصرار کرے کہ نہیں تم کو محصول لینا پڑیگا تم کو معافی کا کوئی حق نہیں اور جب وہ کسی طرح وصول نہیں کرے تو یہ محض خدا کے خوف سے ریلوے کا ٹکٹ مقدار محصول کے برابر خرید کر چاک کر دیتا ہے اور یہ صورت شبہات سے احتراز کرنے کی عام لوگوں کی نظروں میں ہے ورنہ حقیقت میں یہ شبہات کی قسم نہیں بلکہ صریح واجب کا امتثال ہے ۔

عقیدہ کا اثر

پس اگر اس عقیدہ کا اثر اقدام علی الجرائم ہوتا تو علماء صلحاء حلیم سب سے زیادہ بیباک اور جرائم پر اقدام کرنے والے ہوتے حالانکہ مسلمانوں میں یہ طبقہ جو اسلام کے حقیقی مرتبہ کو پہچانتا ہے سب سے زیادہ جرائم سے بچنے والا اور شبہات سے احتراز کرنے والا ہے پس معلوم ہوا کہ عقیدہ کا یہ اثر نہیں ہے جو معترضون نے سمجھا ہے بلکہ اس کا اثر جرائم سے رکنا اور گناہوں سے نفرت پیدا ہونا ہے جس کی وجہ میں عنقریب تبلاؤں گا کہ اس عقیدے کا اثر گناہوں سے نفرت پیدا ہونا کس طرح ہے مگر افسوس ۔

چشم بد اندیش کہ برکندہ باد   عیب نماید ہنرش درنظر

ایسا پاکیزہ مسئلہ جو جرائم کی جڑ کاٹنے والا ہے بد اندیش کو اقدام جرائم کا سبب معلوم ہوتا ہے یہ جواب تو مشاہدہ کے متعلق . . . . ہے کہ حسًا و مشاہدۃً اس عقیدہ کا یہ اثر جو تم تبلا رہے ہو غلط ثابت ہو رہا ہے ۔

عقلی جواب (۲)

اور جواب عقلی اس کا یہ ہے کہ یہ عقیدہ عقلاً اقدام جرائم کا سبب نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کا حاصل صرف یہ ہے کہ حق تعالیٰ جس کو چاہیں گے باوجود کبائر کے عذاب سے معاف کر دیں گے جس میں تعین نہیں ہے یعنی کسی شخص کو یہ معلوم نہیں کہ میرے متعلق مشیت الٰہی بصورت عفو ہے یا بصورت عذاب پھر اس صورت میں کوئی

شخص بھی عذاب سے بے فکر نہیں ہو سکتا بلکہ ہر ایک کو یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ شاید میرے ساتھ قانونی برتاؤ کیا جائے۔ اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک عنین (نامرد) شخص شرم وندامت کی وجہ سے خودکشی پر آمادہ ہو کر سنکھیا استعمال کرے اور وہ اتفاقاً سنکھیا کھا کر ہلاک نہ ہو بلکہ سنکھیا ہضم ہو کر اس کے اندر قوت مردمی پیدا کر دے چنانچہ بعض جگہ ایسے واقعات ہوئے ہیں۔ مگر کیا اس اتفاقی واقعہ سے کسی کو سنکھیا کھانے کی جرأت ہو سکتی ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ ہر عاقل سمجھتا ہے کہ زہر کا خاصہ تو ہلاک کرنا تھا مگر اتفاقاً اس شخص میں آپ کی خاصیت کا ظہور نہ ہوا تو اس سے یہ خاصیت نہیں بدل گئی اس لئے مردانگی بڑھانے کے لئے سنکھیا کھانے کی کوئی نہ اجازت دے سکتا ہے اور نہ ہر شخص اس پر جرأت کر سکتا ہے۔

مراحم خسروانہ سے فریب نہیں کھانا چاہیئے

علیٰ ہٰذا سب لوگوں کو معلوم ہے کہ بعض دفعہ سلاطین وحکام مراحم خسروانہ سے کسی قاتل کو رہا بھی کر دیتے ہیں مگر اس علم کی وجہ سے ہر شخص کو قتل کی وجہ سے ہر شخص کو قتل پر جرأت نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قتل کی اصل سزا تو پھانسی ہی ہے اور عمل بھی اکثر اسی قانون کے مطابق ہوتا ہے اور مراحم خسروانہ کوئی قانون نہیں بلکہ محض حاکم کی مشیت پر ہے کچھ معلوم نہیں کہ وہ کس کے ساتھ مراحم خسروانہ کا برتاؤ کرے، لہٰذا مراحم خسروانہ کے بھروسہ پر اقدام جرائم کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ بعینہٖ اسی طرح کبائر کا بدون عذاب کے معاف ہو جانا بطور مراحم خسروانہ کے ہے پس اس مسئلہ کو اقدام جرائم کا سبب کیونکر سمجھ لیا گیا۔ بھلا اگر کوئی شخص جنگل میں پاخانہ کرنے جائے اور استنجے کے لئے ڈھیلا توڑتے ہوئے اس کو زمین میں سے سونے کا گھڑا مل جائے تو کیا اس اتفاقی بات پر بھروسہ کر کے کوئی شخص بھی زراعت وتجارت سے مستغنی ہو کر بیٹھ سکتا ہے کہ مجھ کو بھی اسی طرح پاخانہ کرتے ہوئے سونے کا گھڑا مل جائیگا۔ ہرگز نہیں۔ اسی طرح اتفاقاً کسی مرتکب کبائر کا بدون عذاب کے بخشدیا جانا اتفاقی ہے اس لئے یہ اقدام جرائم کا سبب ہرگز نہیں ہو سکتا مگر پھر بھی جو لوگ جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں وہ اپنی طبیعت کے خبث سے ایسا کرتے ہیں اس عقیدے کا اس میں کیا دخل۔

گنہ گاروں کی مغفرت

جواب (۳) پھر یہ جو بعض گنہ گاروں کی مغفرت بدون عقاب کے بھی ہو جاتی ہے اس کی وجہ بھی معلوم ہے کہ یہ مغفرت

کیونکر ہو گی؟ یہ بھی کسی عمل صالح کی وجہ سے ہو گی۔ ابوداؤد کی ایک حدیث شریف ہے یہ ابھی یہ مسئلہ معلوم ہوا ہے وہ حدیث شریف یہ ہے کہ ایک شخص نے کسی مقدمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم کھائی اور اس طرح کہا اشهد باللّٰه الذی لا اله الا هو ما فعلت ذالك قسم اس ذات کی جس کے سوا کوئی معبود نہیں کہ میں نے ایسا نہیں کیا۔ فقال رسول اللّٰه بل قد فعلت لکن غفر اللّٰه لك باخلاص قول لا اله الا هو۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تو نے یہ کام ضرور کیا (اور تیری قسم جھوٹی ہے جس کا بہت بڑا گناہ ہوتا ہے) لیکن حق تعالیٰ نے تجھے اس اخلاص کی برکت سے بخش دیا جو لا اله الا اللّٰه کہتے ہوئے تجھ سے صادر ہوا نہ معلوم اس وقت کس دل سے اس نے خدا کا نام لیا ہے جو اس درجہ مقبول ہو گیا (یعنی اس نے خدا کا نام اس وقت کامل اخلاص سے لیا تھا اس کی برکت سے حلف کاذب کا گناہ معاف ہو گیا) اس کا مطلب نہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈگری اس کی کر دی۔ بلکہ محض اس گناہ کی مغفرت کا ذکر فرمایا مقصود ہے کیونکہ جب وحی سے اس کا کاذب فی الحلف ہونا معلوم ہو گیا تو اب ڈگری اس کے حق میں کیونکر ہو سکتی تھی۔ تو دیکھئے گناہ کتنا سنگین تھا کہ جھوٹی قسم کھائی اور وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم کھانا ایسا ہے جیسا خدا کے سامنے۔ اور ظاہر ہے کہ محل وزمان کی عظمت سے بھی فعل میں عظمت پیدا ہو جاتی ہے۔ زنا کرنا گناہ ہے مگر مسجد میں زنا کرنا اور بھی اشد ہے اور اگر کوئی نامعقول کعبہ شریف میں ایسا فعل کرے تو بہت ہی سخت ہے، اسی طرح جھوٹی قسم کھانا گناہ ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا گناہ اور بڑھ جاتا ہے کیونکہ آپؐ نائب خدا ہیں آپؐ کے سامنے جھوٹی قسم ایسی ہے جیسی خدا کے سامنے ہو۔

ایک شبہ کا ازالہ

شاید کوئی یہ کہے کہ ہم تو اس وقت بھی جو کرتے ہیں سب خدا ہی کے سامنے کرتے ہیں اور جس جگہ جو کام بھی ہو گا وہ خدا کے سامنے ہو گا تو چاہیئے ہر جگہ وہی گناہ ہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم سے ہوتا ہے اس کا جواب یہ ہے کہ اس وقت تو تم خدا کے سامنے ہو مگر خدا تمہارے سامنے نہیں اور میرا مطلب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے قسم کھانا ایسا ہی ہے جیسا خدا کو سامنے سمجھ کر قسم کھانا۔ خلاصہ یہ کہ قرب کی دو قسمیں ہیں ایک قرب حسی یہ تو جہاں ہوتا ہے طرفین سے ہوتا ہے اور ایک قرب علمی یہ ایک طرف سے بھی ہو سکتا ہے پس اس وقت جو تم خدا کے سامنے ہو یہ قرب علمی ہے کہ خدا تعالیٰ سے تمہارا کوئی حال مخفی نہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں مگر اس حالت میں تم کو قرب حاصل نہیں، ورنہ

ہر شخص کا مقرب ہونا لازم آئے گا اور قیامت میں جو تم خدا کے سامنے ہوں گے وہ قرب جانبین سے ہوگا کہ تم بھی خدا تعالیٰ کے سامنے ہوں گے۔ اور خدا تعالیٰ بھی تمہارے سامنے ہوں گے نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ میں قرب علمی مراد ہے۔ اسی لئے یہ نہیں فرمایا گیا کہ تم بھی ہم سے قریب ہو بلکہ صرف اپنا قرب بیان فرمایا ہے کیونکہ یہاں تماشہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ تو ہم سے قریب ہیں مگر ہم ان سے دور ہیں۔

یار نزدیک تر زمن بہ من است — ویں عجب تر کہ من ازوے دورم

تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جھوٹی قسم ایسی ہے جیسی قیامت میں خدا کے سامنے جھوٹی قسم کھانا۔ جب کہ تم بھی حق تعالیٰ کو اپنے سامنے سمجھو گے۔ (محاسن اسلام ص۹)

اللہ کا بے انتہا عفو و کرم

جواب (۴) چوتھا جواب یہ ہے کہ بعض گناہوں کا بدون عقاب کے ہوجانا یہ حق تعالیٰ کا عفو و کرم ہے اس کو سن کر لوگوں کو معلوم ہوگیا کہ حق تعالیٰ بڑے ہی رحیم و کریم ہیں جو اپنے بندوں پر بے حد عنایت فرماتے ہیں اور قاعدہ ہے کہ طبائع سلیمہ میں عنایت و کرم سے اطاعت و عبادت کو ترقی ہوتی ہے۔ نہ کہ سرکشی کو، اگر آقا کی عنایت زیادہ ہوں تو اس کی اطاعت کا شوق بڑھتا ہے۔ وہ نوکر بڑا ہی پاجی ہے جو آقا کی بے حد عنایات کے بعد بھی سرکشی ہی کرے۔ طبائع سلیمہ تو احسان و کرم و عنایات سے بندہ بے درم ہوجاتی ہے اس لئے یہ عقیدہ اقدام علی الجرائم کا سبب ہرگز نہیں بلکہ جرائم و سرکشی کی جڑ کاٹنے والا ہے۔ جن لوگوں کی طبائع سلیم ہیں وہ خدا کی ان نعمتوں اور عنایتوں کو دیکھ کر اور زیادہ عبادت کرتے ہیں۔ چنانچہ جو لوگ کہ اسلام سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں ان میں یہ اثر مشاہد ہے اب اگر اس عقیدہ سے کسی میں اقدام جرائم کا وصف پیدا ہو تو کہا جائیگا کہ یہ اس عقیدہ کا اثر نہیں بلکہ اس شخص کی کجی طبع کا اثر ہے۔ جیسا بادشاہ کا کریم ہونا طبائع سلیمہ کے لئے زیادت وفاداری کا سبب ہوتا ہے گو بعض نالائق بادشاہ کے کرم کی وجہ سے جرائم پر بھی دلیر ہوجاتے ہیں مگر کیا اس کا سبب بادشاہ کے کرم کو کہا جائے گا یا ان کی بدطینتی کو اس کا فیصلہ عقلاء خود کر سکتے ہیں بعض لوگوں کو یہ آیت لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا سے دھوکا ہوا ہے اور وہ بے فکر ہو گئے ہیں کیونکہ وہ اس کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ یقیناً سب گناہوں کو معاف کر دیں گے کیونکہ لمن یشاء کی قید نہیں ہے۔ سو ان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اول تو یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ اس کا شانِ

نزول ان لوگوں کے بارے میں ہوا ہے جو کفر سے اسلام کی طرف آنا چاہتے تھے۔ مگر ان کو اسلام سے یہ خیال مانع تھا کہ ہم نے حالت کفر میں بڑے بڑے جرائم کئے ہیں ان کا کیا حشر ہوگا۔ آیا اسلام کے بعد ان پر مواخذہ ہوگا یا نہیں۔ اگر مواخذہ ہوا تو پھر اسلام ہی سے کیا فائدہ۔

کفر سے پہلے والے گناہ

چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ کفار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا لو اسلمنا فما یفعل بذنوبنا التی اسلفنا او کما قالوا) کہ اگر ہم اسلام لے آئیں تو ہمارے پہلے گناہوں کے متعلق کیا برتاؤ ہوگا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی جس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کے بعد پہلے گناہ جو حالت کفر میں کئے گئے ہیں سب معاف ہوجائیں گے پس اس میں جو مغفرت کا دعویٰ حتمی ہے وہ عام نہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ اور لوگوں کے گناہ بدون عقاب کے معاف نہ ہوں گے نہیں دوسروں کے بھی معاف ہوں گے جیسا کہ پہلے بیان کر چکا ہوں لیکن ان کے لئے وہی وعدہ ہے جو دوسری آیت میں مذکور ہے۔ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ جس میں حتمی وعدہ نہیں کیا بلکہ مشیئت کی قید سے مشروط ہے اور اس آیت میں جو بلا قید حتمی وعدہ کیا گیا ہے یہ صرف نو مسلموں کے لئے ہے کہ اسلام سے ان کے پہلے گناہ ضرور معاف ہوجائیں گے جیسا کہ شان نزول سے معلوم ہو رہا ہے اور شان نزول مثل تفسیر کے ہے بہت سے نصوص بظاہر عام ہیں لیکن شان نزول سے ان کی تقیید کی جاتی ہے۔

(وعظ محاسن اسلام ص۸)

(۱۸) مسلمانوں کا جانوروں کو ذبح کرنا عقل و نقل کی روشنی میں

دوسری قوموں کا یہ شبہ کہ یہ لوگ بڑے سنگدل ہوتے ہیں کہ انھیں جانوروں کے گلے پر چھری پھیرتے ہوئے ذرا بھی رحم نہیں آتا۔ محض ناواقفی یا تعنت[۱] سے ناشی[۲] ہے۔ مگر عجیب بات ہے کہ یہ شبہ اور یہ اعتراض فقط گائے کی قربانی کے متعلق ہے۔ چوہے۔ بکری، مرغی۔ کبوتر کے متعلق نہیں۔ معلوم ہوتا ہے دال میں کالا ہے۔ یعنی اس شبہ کا سبب ترحم نہیں ہے۔ بلکہ محض حمیت مذہبی ہے اور اگر کوئی ذہین آدمی مذہب سے قطع نظر کر کے سب جانوروں کے

---

[۱] سرکشی۔ زیادتی۔ [۲] پیدا ہونے والی۔

متعلق یہی الزام دے. تو اس کا جواب یہ ہے کہ اسے یہ کیا خبر کہ مسلمانون نرم دل ہوتے ہیں یا سخت دل ۔ پس ان کا اعتراض اگر حمیت مذہب سے نہیں تو ناواقفیت مدیے ضرور ہے. پس ان کا یہ فیصلہ بہت ہی ظاہر ہے مگر باوجود اس کے ظاہر ہونے کے علماء مناظرین نہ معلوم جواب میں کہاں کہاں پہونچتے ہیں. لیکن ان پر بھی اعتراض نہیں ہو سکتا کیونکہ وہاں تحقیق مقصود نہیں ہوتی. محض الزام و اسکات[1] مقصود ہوتا ہے ۔ باقی جہاں تحقیق منظور ہوتی ہے وہاں حق تعالیٰ کی جانب سے اصل حقیقت کا القاء ہوتا ہے. سو الحمدللہ حق تعالیٰ اس وقت مجھے جواب میں یہ بات سمجھا دی کہ انھیں کیا خبر کہ مسلمانوں میں رحم نہیں ۔ اب آپ سب مسلمان کو ٹٹول لیجئے کہ ذبح کے وقت کیا قلب کی کیفیت ہوتی ہے. کڑھتا ہے یا نہیں. بعض موجودہ بزرگوں کا قصہ سنا ہے کہ ذبح کے وقت آنکھ سے آنسو جاری ہو گئے. آخر یہ کیا بات ہے ۔ رحم اور کسے کہتے ہیں. لیکن اس سے بڑا کمال مسلمانوں کا عدل[2] ہے کہ ایک ہی طرف نہیں چلے گئے ۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا وسط کی تفسیر عدل ہے کہ اعتدال ہو ۔ قوت وعمل دونوں ہیں کہ جزیرہ و بلاہت کے وسط میں حکمت جبن و تہور کے وسط میں شجاعت اسی طرح قوت شہویہ خمود و فجور میں توسط عفت ہے ۔ اور تینوں کے مجموعہ یعنی حکمت و شجاعت و عفت کا نام عدل ہے تو یہ امت عادلہ ہے ۔ حق تعالیٰ نے احکام ایسے رکھے ہیں کہ اگر ان کے اندر صفت عدل کم ہو تو ان احکام کے برتنے سے درست ہو جائے نہ افراط ہو کہ چھری ڈال دو ۔ اور نہ تفریط کہ رحم ہی نہ ہو. غرض دونوں میں اعتدال رکھو تو ہمارا کمال یہ ہے کہ رحم بھی ہے اور چھری بھی پھیرتے ہیں مگر یہ سمجھ کر ع ۔

ع آنکہ جان بخشد اگر بخشد رواست

اگر کوئی کہے کہ انہوں نے تو مارا نہیں تو اس کا جواب دوسرے مصرعہ میں دیتے ہیں ع

ع نائب است او دستِ او دست خداست

یہ تو مسلّم ہے کہ جان جس کی دی ہوئی ہو ۔ وہ لے سکتا ہے ہم اس کے نائب ہیں اس نے ہمیں حکم دیا ہے اس لیے ہم نے چھری پھیری ۔ باقی ہم نے جان نہیں نکالی ہم نے تو فقط راستہ کھولدیا ہے جان تو انھیں نے نکالی ہے پھر کیا شبہ رہا اہل اسلام پر کہ بڑے سنگدل ہوتے ہیں. آپ بڑے رحم دل ہوتے ہیں کہ خود چوہے نہیں مارتے مسلمانوں کے محلے میں چھوڑ آتے ہیں کہ یہ

[1] خاموش کرنا ۔ [2] انصاف

ماریں جب تم ہمیں موش کُشی میں اپنا نائب بناتے ہو تو اگر اللہ تعالیٰ نے گاؤ کشی میں ہمیں اپنا نائب بنایا تو کیا قباحت ہو گئی ۔ اللہ تعالیٰ کی نیابت میں یہ فائدہ بھی ہے کہ مارو اور کھاؤ اور تمہاری نیابت میں تو فقط مار کر پھینکدینا ہی ہے اور کچھ بھی نہیں ۔ سبحان اللہ! یہ رحم دلی ہے کہ ہم سے نہیں مارے جاتے تو تم مار دو ۔ نیابت اور کسے کہتے ہیں ۔ یہ تو زبان سے بھی کہنے سے بڑھ کر ہے اگر زبان سے کہتے تو ایک مسلمان بھی نہ کر سکتا. کیونکہ یہ کس کی غرض تھی کہ وہ اپنا کاروبار چھوڑ کر تمہارے گھروں اور دوکانوں پر چوہے مارنے جاتا ۔ مگر ان کے گھر لا کر چھوڑ دیئے کہ اچھی طرح ان کو مار سکیں ۔

ایک حکایت

یہ رحم تو ویسا ہی ہو گیا کہ کسی ایک کی بے حیا بہو تھی اس سے کسی نے پوچھا کہ تمہارا شوہر کہاں گیا ہے حیا کی وجہ سے منہ سے تو نہ کہہ سکی مگر بتلانا بھی ضرور تھا ۔ تو آپ نے کیا کیا کہ لہنگا اٹھا اس کے سامنے موتا اور پھاند گئی ۔ مطلب یہ کہ ندی پار گیا ہے ۔ تو حضرت بعض ترحم بھی ایسا ہی ہوتا ہے ۔ کسی نے زنا کیا ۔ حمل رہ گیا رسوائی ہوئی لوگوں نے کہا ۔ کمبخت تو نے عزل کیوں نہ کر لیا (عزل انزال سے پہلے علیحدہ ہو جانے کو کہتے ہیں) تو آپ کہتے ہیں کہ سنا تھا کہ عزل مکروہ ہے ۔ کم بخت منحوس اور زنا کو نسا فرض سنا تھا ۔ بعضوں کا تقویٰ بھی ایسا ہی ہوتا ہے ۔ یہ تو ترحم ویسا ہی ہے جیسی اس بہو کی شرم تھی کہ منہ سے بولنے میں تو حیا تھی اور لہنگا کھول کر سامنے بیٹھ جانے میں حیا نہ تھی اور پھر مسلمانوں پر اعتراض حضرات میں بقسم کہتا ہوں کہ ترحم مسلمانوں کے برابر کسی قوم میں نہیں ۔ مگر امتحان کے وقت معلوم ہوتا ہے ۔ کسی کا قطعہ ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں ؎

دیکر قسم کہے کہ تو میرا لہو پیئے ✤ گرمی نہ جائے جلد سے پیالہ شراب کا
اس وقت ہم سلام کریں قبلہ آپ کو ✤ گر کچھ بھی خوف کیجئے روز حساب کا
اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام ✤ عامل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

مسلمانوں کی رحم دلی

دنیا کے واقعات نے کھلم کھلا ثابت کر دیا ہے کہ ترحم کے موقعوں پر ترحم کرنا یہ خاصہ مسلمانوں ہی کا ہے ۔ مسلمانوں کے برابر کوئی قوم رحمدل نہیں ۔ میرے پاس ایک برہمن کا خط آیا تھا کہ مسلمانوں پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جیو مارتے ہیں ۔ مثلاً گاؤ کشی وغیرہ کرتے ہیں مگر وہ جیو گا نہیں مارتے (جیو گا آدمی کے نفس کو کہتے ہیں مگر یہ معترض قوم جیو گا مارتی ہے ۔ یعنی آدمیوں پر ظلم کرتی ہے ۔ مجھے اس شخص کے قول نقل

کرنے سے فقط یہ مقصود ہے۔

ع اَلْحَقُّ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْاَعْدَاءُ "

یعنی جادو وہ جو سر پر چڑھ کر بولے اب تو کئی شہادتیں ہوگئیں کہ مسلمان بڑے رحم دل ہوتے ہیں۔ بہر حال ان کی رحمدلی ثابت ہوگئی۔ (وعظ روح الحج والثج ص۱۵)

(۱۹) ذبح کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب

ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ شریعت اسلامیہ سے زیادہ رحم کسی مذہب میں بھی نہیں ہے۔ اور ذبح حیوان رحم کے خلاف نہیں۔ بلکہ ان کے حق میں اپنی موت مرنے سے مذبوح ہو کر مرنا بہتر ہے۔ کیونکہ خود مرنے میں قتل و ذبح کی موت سے زیادہ تکلیف ہوتی ہے۔ رہا یہ سوال کہ پھر انسان کو ذبح کر دیا جایا کرے تاکہ آسانی سے مر جایا کرے اس کا جواب یہ ہے کہ حالت یاس سے پہلے ذبح کرنا تو دیدہ و دانستہ قتل کرنا ہے اور حالت یاس پتہ نہیں چل سکتا۔ کیونکہ بعض لوگ ایسے بھی دیکھے گئے ہیں کہ مرنے کے قریب ہو گئے تھے پھر اچھے ہو گئے اور یہ شبہ حیوانات میں کیا جائے کہ ان کی تو یاس کا بھی انتظار نہیں کیا جاتا۔ جواب یہ ہے کہ بہائم اور انسان میں فرق ہے وہ یہ کہ انسان کا تو ابقا[1] مقصود ہے۔ کیونکہ خلق عالم سے وہی مقصود ہے۔ اس لئے ملائکہ کے موجود ہوتے ہوئے اس کو پیدا کیا گیا۔ بلکہ تمام مخلوق کے موجود ہونے کے بعد اس کو پیدا کیا گیا۔ کیونکہ نتیجہ اور مقصود تمام مقدمات کے بعد موجود ہوا کرتا ہے اس لئے انسان کے قتل اور ذبح کی اجازت نہیں دی گئی۔ ورنہ بہت لوگ ایسی حالت میں ذبح کر دیئے جائیں گے۔ جس کے بعد ان کے تندرست ہونے کی امید تھی۔ اور ذبح کرنے والوں کے نزدیک وہ یاس کی حالت تھی اور جانور کا ابقاء مقصود نہیں۔ اس لئے ان کے ذبح کی اجازت اس بنا پر دیدی گئی کہ ذبح ہو جانے میں ان کو راحت ہے۔ اور ذبح ہو جانے کے بعد ان کا گوشت وغیرہ بقائے انسانی میں مفید ہے جس کا ابقاء مقصود ہے۔ اس کو اگر ذبح نہ کیا جائے اور یونہی مرنے کے لئے چھوڑ دیا جائے تو وہ مردہ ہو کر اس کے گوشت وغیرہ میں سمیت کا اثر پھیل جائے گا اور اس کا استعمال انسان کی صحت کے لئے مضر ہوگا تو ابقاء انسان کا وسیلہ نہ بنے گا اور قصاص جہاد میں چونکہ افناء[2] بعض افراد

[1] باقی رکھنا [2] فنا کرنا۔ چلتا کرنا۔

بغرض ابقاء جمیع الناس متیقن ہے اس لئے وہاں قتل انسانی کی اجازت نہیں دی گئی مگر ساتھ ہی اس کی رعایت کی گئی کہ حتی الامکان سہولت کی صورت سے مارا جائے۔ یعنی قصاص میں جو کہ قتل اختیاری ہے تلوار سے اور جہاد میں مثلہ وغیرہ کی ممانعت ہے۔ (افناء المحبوب ص۵)

(۲۰) مُردہ کو دفن کرنا بہتر ہے یا جلا دینا؟

اسلام کی خوبی یہ ہے کہ مُردہ کے دفن کا حکم دیا گیا اور جلانے کی ممانعت کر دی کہ دفن میں اکرام[1] ہے، اور احراق[2] میں اس اصل سے عدول ہے۔ بعض مدعین فلسفہ جلانے کی خوبیاں بیان کرتے ہیں اور دفن کی خرابیاں کہ اس سے مٹی خراب ہوتی ہے اور اس سے جو بخارات اٹھتے ہیں وہ گندے زہریلے اور متعفن ہوتے ہیں اس طرح کے نکتوں سے ثابت کرتے ہیں کہ جلانا اچھا ہے مگر ہم تو اس کے خلاف مشاہدہ کر رہے ہیں کہ کسی مدفون کی قبر پر ہمیں بدبو نہیں آئی۔ مگر مرگھٹ پر تو اس قدر متعفن اور گندی ہوا ہو جاتی ہے کہ ناک نہیں دی جاتی۔ ایسے مہمل نکتے تو ہر چیز میں بیان ہو سکتے ہیں مگر سلامتی فطرت حق و باطل کا فیصلہ خود کر لیتی ہے بلکہ عقل تو دفن کو پسند کرتی ہے کہ اس میں بدن کو اس کی اصل میں پہنچا دیا۔ باقی خاک ہونا اصل ہے سو اس کی دلیل یہ ہے کہ ہر عنصر کا اپنی چیز کی طرف میلان ہے۔ اگر کوئی شخص کوٹھے پر سے اچھلے اگر وہ اوپر چلا جاتا تو ہوا یا نار غالب ہوتی۔ اب تو خاک غالب ہے۔ اور آب (پانی) کا غلبہ ہونا بھی ظاہر ہے ورنہ آب میں پہنچ کر عُمق کی طرف نہ جاتا بس خاک کا غلبہ متعین ہو گیا۔ اور یہ قاعدہ عقلی ہے کہ كُلُّ شَيْءٍ يَرْجِعُ اِلٰى اَصْلِهٖ (ہر چیز اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے) تو خاک میں دفن کرنا بالکل عقل کے موافق ہے اور اس کے ماسوا تسب فطرۃ سلیمہ اور عقل کے بالکل خلاف ہے۔ باقی احراق (جلانے) کی رسم کیسے نکلی۔ سو ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں پرانی تاریخ میں اوتار اور دیوتاؤں کی معاشرت کا ذکر ہے یہ وہ جن تھے غالباً۔ ان کے شرائع اور تھے اور انسان کے اور تو ان عنصر غالب یعنی نار کا مقتضیٰ عقلی یہ تھا کہ بعد موت ان کے ابدان کو اسی میں ملا دیا جائے چونکہ ان میں آگ غالب تھی۔ اس لئے آگ میں جلا دیئے جاتے تھے۔ یہ قصے ان کی کتابوں میں مذکور ہوں گے۔ جہالت اور نادانی سے خدا بچائے یہ ایسے بزرگوں کی سنت سمجھ کر خود بھی یہی کرنے لگے۔ ع۔

[1] عزت دینا [2] جلا ڈالنا۔

ع چوں ندیدند حقیقت رہ

رہ افسانہ زدند ۔ گویہ بات تاریخ سے ثابت نہیں مگر قرائن سے یہی مؤید ہیں۔

(وعظ ارواح اربع والتیج ص ۱۲)

حصہ اوّل ختم شد

فہرست مضامین حصہ دوم

روافض کے اعتراضات کے جوابات

(۱) بوقت وصال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دوات مانگنا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ کہنا کہ کیا ضرورت ہے

یہ اعتراض حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر نہیں بلکہ اس میں تو خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی کتمانِ حق کا اعتراض لازم آتا ہے۔ آپ پر تبلیغ احکام فرض تھی۔ اگر کوئی حکم واجب تھا تو آپ نے کیوں نہ ظاہر فرما دیا۔ اگر اس وقت دوات قلم نہیں آئے تو دوسرے وقت منگا کر تحریر فرما دیتے۔ کیونکہ آپ کئی روز اس واقعہ کے بعد زندہ رہے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ پنجشنبہ کا ہے اور وفات دوشنبہ کو ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی نیا حکم ارشاد فرمانا نہ تھا بلکہ کسی امر قدیم کی تجدید و تاکید مقصود تھی۔

(ب) چونکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سمجھ گئے اس لئے آپ نے گوارا نہ فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تکلیف فرمائیں۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ طبیب کسی کو زبانی نسخہ بتلا دے۔ پھر براہ شفقت کہے قلم دوات لاؤ لکھ دوں اور مریض یہ دیکھ کر کہ اس وقت ان کو تکلیف ہوگی کہے کہ کیا حاجت ہے اس وقت تکلیف مت دو۔

الزامی جواب اور جواب الزامی یہ ہے کہ قصہ حدیبیہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے صلح نامہ لکھا تھا۔ هَذا ما قضى عليه محمد رسول الله[1] کفار نے مزاحمت کی کہ ابن عبداللہ لکھو، کیونکہ اسی میں تو جھگڑا ہے اگر ہم رسالت کو تسلیم کرلیں تو نزاع ہی کس بات

[1] یہ فیصلہ ہے جو اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا۔

کی، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے فرمایا کہ اس کو مٹا دو۔ انھوں نے انکار فرمایا۔ پس ایسی مخالفت تو اس میں بھی ہوئی۔ جس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مخالفت کی تھی پھر فرمایا کہ جواب الزامی مجھے پسند نہیں ہے مگر بطور لطیفہ کے اس وقت بیان کر دیا (مجادلات معدلت حصہ اول دعوات عبدیت ص ۲۲۳)

(۲) اس شبہ کا جواب کہ حضرت علی رض کو خلیفہ اول کیوں نہیں بنایا

جواب (۱) ہمارے بعض بھولے بھالے بھائی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے لئے لڑتے ہیں کہ شیخین نے خلافت لے لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو نہ دی۔ میں کہتا ہوں کہ شیخین کے لئے دعا کیجئے اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اول ہی سے خلافت دیدی جاتی اور اتنی مدت تک یہ خلیفہ رہتے اور ان حضرات کی مشقت و تعب دین کے لئے۔ اور قلت دنیا کے لئے معلوم ہو چکی۔ تو ان کو کس قدر مزید تکلیف ہوتی جو اٹھائے نہ اٹھتی۔ ان حضرات نے یہ بڑا سلوک کیا کہ اس مصیبت کو خود بانٹ لیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو تکلیف نہ پہنچنے دی اور جو کچھ ان حضرات میں شکر رنجی ہوئی۔ اول تو بہت واقع غلط مشہور ہیں۔ دوسرے جب اتحاد اور دوستی ہوتی ہے تو شکر رنجی بھی ہو ہی جاتی ہے مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے دو خادموں سے جو کہ آپس میں نہایت درجہ اتحاد رکھتے تھے پوچھا تم دونوں میں کبھی لڑائی بھی ہوتی ہے یا نہیں۔ انھوں نے عرض کیا حضور کبھی کبھی ہو جاتی ہے۔ مگر پھر اتحاد ہو جاتا ہے۔ فرمایا کہ تمہارا اتحاد پائیدار ہے۔ ذوق کہتا ہے ؎

بے محبت نہیں اے ذوق شکایت کے مزے　　بے شکایت نہیں اے ذوق محبت کے مزے

ایک عربی حکیم لکھتا ہے "وَيَبْقَى الْوُدُّ مَا بَقِيَ الْعِتَابُ[۱]"، اور وجہ اس کی یہ ہے کہ دوستی جب باقی رہتی ہے کہ دل میں غبار باقی نہ رہے۔ اور اگر عتاب نہ کیا جائے۔ اور بات کو دل میں رکھا جائے تو عمر بھر بھی دل سے کدورت نہ نکلے گی اور اگر دل کی بھڑاس نکال لی جائے تو پھر دل صاف ہو جاتا ہے۔ حتیٰ کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو کہ سب سے زیادہ محب اور محبوب تھیں، وہ بھی کبھی کبھی ناز کے طور پر روٹھ جاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ میں تمہاری خوشی و ناراضی کے وقت کو پہچانتا ہوں جب تم ناراض ہوتی تو قسم میں لَا وَرَبِّ اِبْرَاهِيْمَ[۲] کہتی

۱؎ جب تک عتاب رہتا ہے محبت باقی رہتی ہے ۲؎ نہیں ابراہیم کے رب کی قسم۔

ہو۔ اور جب خوش ہوتی ہو تو لَا وَرَبِّ مُحَمَّدٍ کہتی ہو۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا عرض کرتی تھیں وَهَلْ اَهْجُرُ اِلَّا اِسْمَكَ[۱] کہ حضور اس وقت صرف آپ کا نام نہیں لیتی ورنہ دل میں تو آپ ہی بسے ہوتے ہیں۔ تو اگر آپس میں ان حضرات میں کوئی بات ہوئی بھی ہو تو باہم ایک دوسرے پر ناز ہے۔ ہمارا منہ نہیں کہ ہم اعتراض کریں۔

ایک واقعہ کانپور میں ایک صاحب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو برا بھلا کہتے تھے۔ ایک مرتبہ اتفاق سے میں ان سے ملا انھوں نے وہی تذکرہ چھیڑا۔ اور یہ حدیث پڑھی۔

مَنْ سَبَّ اَصْحَابِيْ فَقَدْ سَبَّنِيْ وَمَنْ سَبَّنِيْ فَقَدْ سَبَّ اللّٰهَ۔ اور کہا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شان میں نامناسب الفاظ کہدیتے تھے تو وہ اس حدیث کے مصداق ہو گئے۔ میں نے کہا کہ صاحب آپ نے غور نہیں کیا۔ اس حدیث کے یہ معنی نہیں آپ نے سمجھے۔ بلکہ اس کے معنی دوسرے ہیں ان کے سمجھنے کے لئے اول آپ ایک محاورہ سمجھئے کہ اگر کوئی شخص یوں کہے کہ جو شخص میرے بیٹے کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے گا میں اس کی آنکھیں نکالدوں گا تو آپ بتلائیے کہ یہ وعید کس شخص کے لئے ہے آیا اپنی دوسری اولاد کے لئے بھی کہ اگر وہ آپس میں لڑیں جھگڑیں تو ان کے ساتھ بھی وہی کیا جاوے گا۔ یا عزیزوں اور اجانب کے لئے ہے۔

ظاہر ہے کہ اجانب کے لئے یہ وعید ہے بس حدیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ غیر اصحاب میں سے جو شخص میرے اصحاب کو برا کہے اس کے لئے یہ حکم ہے (فضائل الخشیۃ ص ۳۶)

شیخین رض کے احسانات (ب) میں بقسم کہتا ہوں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل سے پوچھا جائے وہ تو حضرات شیخین کے احسان مند ہوں گے کہ انھوں نے ان کو مصیبت سے بچا لیا کیونکہ حضرات صحابہ کی خلافت شاہان اودھ کی سی بادشاہت نہ تھی کہ رات دن عیش و مستیاں کرتے ہوں وہاں تو ایسی بادشاہت تھی کہ ایک دن گرمی کے سخت دوپہر میں جب کہ لو چل رہی تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ تنہا جنگل کی طرف جا رہے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے دور سے دیکھا تو پہچان لیا کہ امیر المومنین ہیں جب ان کے گھر سے قریب ہوئے تو آواز دی کہ امیر المومنین اس وقت سخت گرمی ۔ ۔ ۔ اور لو میں کہاں جا رہے ہیں۔ فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ ضائع ہو گیا ہے اس کی تلاش میں جا رہا ہوں

۱؎ میں صرف آپ کا نام چھوڑ دیتی ہوں

انہوں نے عرض کیا کسی خادم کو نہ بھیج دیا۔ فرمایا کہ قیامت میں تو سوال مجھ سے ہوتا۔ خادم سے سوال نہ ہوتا۔ عرض کیا پھر تھوڑی دیر توقف کرکے تشریف لے جایئے ذرا گرمی کم ہوجائے۔ فرمایا نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا جہنم کی آگ اس سے بھی زیادہ گرم ہے یہ کہہ کر اسی دھوپ اور لو میں جنگل تشریف لے گئے یہ سلطنت تھی۔ ایک بار آپؓ منبر پر کھڑے ہوئے خطبہ پڑھ رہے تھے۔ خطبہ میں فرمایا۔ اَسْمَعُوْا[1] وَاَطِيْعُوْا ایک شخص نے کھڑے ہوکر کہا۔ لَا نَسْمَعُ وَلَا نُطِيْعُ[2]۔ آپ نے پوچھا کیوں۔ اس نے جواب میں کہا کہ آپ نے دو کپڑے پہن کر رکھے ہیں جو مال غنیمت سے تقسیم ہوئے ہیں۔ مگر سب کے حصہ میں تو ایک کپڑا آیا تھا۔ آپ نے دو کپڑے کیسے لئے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ بے شک تم سچ کہتے ہو۔ اے عبداللہ! تم اس کا جواب دو۔ اسی پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ کھڑے ہوئے اور کہا۔ امیر المومنین کے پاس آج کوئی کپڑا نہ تھا۔ جس کو پہن کر نماز پڑھاتے تو میں نے اپنے حصہ کا کپڑا ان کو عاریۃً دیدیا ہے اس طرح ان کے پاس دو کپڑے ہوگئے۔ جن میں سے ایک کی لنگی بنائی اور ایک کی چادر۔ یہ جواب سن کر سائل رونے لگا۔ اور کہا جزاک اللہ۔ اب آپ خطبہ پڑھیں ہم سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔ یہ ان حضرات کی حکومت تھی کہ رعایا کا ہر شخص ان پر روک ٹوک کرنے کو موجود تھا۔ تو ایسی صورت میں خلافت کوئی راحت کی چیز نہ تھی۔

کیا حضرت علیؓ طالبِ دنیا تھے

تو کیا حضرت علیؓ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہوسکتے تھے کبھی نہیں۔ دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ خلافت بڑی راحت کی چیز تھی۔ تو اس کی وہ تمنا کرے جس کے دل میں دنیا کی ہوس اور وقعت ہو تو کیا نعوذ باللہ ان لوگوں نے حضرت علیؓ کو دنیادار اور طالب دنیا سمجھ رکھا ہے جو وہ اس کے نہ ملنے سے رنجیدہ ہوئے ہوں گے، اگر وہ ایسا سمجھیں تو ان کو یہ خیال مبارک ہو۔ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ حضرت علیؓ کی نظر میں دنیا کی کچھ بھی وقعت یا ہوس نہ تھی۔ کیونکہ ان کو تعلق مع اللہ کی سلطنت حاصل تھی جس کی خاصیت یہ ہے کہ ؎

آں کس ترا شناخت جاں را چہ کند
فرزند و عیال و خانماں را چہ کند

پھر ان کو خلافت دیر میں ملی تو کیا اور نہ ملتی تو کیا ان کو کبھی بھی اس کا رنج نہ ہوسکتا تھا۔ بلکہ وہ تو اس سے خوش ہوتے پھر جس بات سے ان کو خوشی ہو آپ اس میں رنج کرنے والے کون

---

[1] سنو اور مانو۔ [2] نہ سنوں گا اور نہ مانوں گا۔

ہیں یہ وہی مثل ہوئی مدعی سست گواہ چست، اسی دنیا کی بے وقعتی کو حق تعالیٰ فرما رہے ہیں کہ مال و بنون زینت حیوٰۃ دنیا ہیں۔ (مظاہر الآمال ص۱۹)

گمراہ فرقہ کا غلط دعویٰ

(ج) ایک فرقہ ضالہ نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی خلافت بلافصل ایک حدیث سے ثابت کی ہے۔ جس میں حضرت کی نسبت لَحْمُكَ لَحْمِيْ وَدَمُكَ دَمِيْ آیا ہے۔ اور استدلال اس طرح کیا ہے کہ حضرت علیؓ عین رسولؐ ہیں۔ اس لئے ان کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے کو خلافت کا استحقاق نہیں تھا۔ اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ یہ حدیث ثابت نہیں دوسرے میں کہتا ہوں کہ اگر اس سے عینیۃ حقیقت مراد ہے تو اس سے حضرت علیؓ کی خلافت ہی کی نفی ہوتی ہے کیونکہ خلیفہ تو غیر ہی ہونا چاہیئے کوئی شخص خود اپنا خلیفہ نہیں ہوا کرتا۔ بس بہت سے بہت تم یہ کہہ سکتے ہو کہ حضرت ابوبکرؓ جیسے حضورؐ کے خلیفہ تھے حضرت علیؓ کے بھی خلیفہ تھے تو اس میں ہم تم سے نزاع نہ کریں گے ؎

شادم کہ از رقیباں دامن کشاں گذشتی ‏ ‏ گو مشت خاک ماہم بر باد رفتہ باشی

مگر ان کا مدعا تو باطل ہوگیا۔ اور ایک جواب دوسرے علماء نے دیا ہے کہ حضرت علیؓ عینِ رسولؐ ہیں تو حضرت فاطمہؓ کے ساتھ ان کا نکاح کیسے ہوا۔ یہ تو حضرات حسنینؓ کے حق میں معاذ اللہ سخت گالی ہوگی۔ اور اگر عینیت حقیقۃً مراد نہیں اور یقیناً مراد نہیں بلکہ صرف عینیت عرفیہ مراد ہے۔ جیسا کہ صوفیہ حضورؐ کو اسی معنی کر عین حق کہتے ہیں تو پھر یہ حضرت علیؓ کے ساتھ خاص نہیں۔ اس معنی کر تو ہر صحابی عین رسول تھا۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سبھی کو تعلق تھا کسی کو بھی اجنبیت نہ تھی۔

(ارضاء الحق حصہ دوم ص۱۲)

(۳) ازواج مطہرات بھی اہل بیت میں داخل ہیں

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاء ہے۔ اللھم اجعل رزق آل محمدؐ قوتا۔ کہ اے اللہ آل محمد کا رزق بقدر قوت کیا جائے اور قدر قوت وہ ہے جس میں بقدر کفایت گذر ہوجائے۔ کچھ فاضل نہ ہو۔ اور اس میں شک نہیں کہ ازواج مطہرات بھی آل محمد میں داخل ہیں اس لئے کہ دعاء ان کو بھی شامل تھی۔ اور اسی طرح ذریت بھی داخل ہے بلکہ اصل مقتضاء لغت یہ ہے کہ ازواج تو آل محمد میں اصالۃً داخل ہوں اور ذریت تبعاً داخل ہوں۔ کیونکہ آل کہتے ہیں اہل بیت کو یعنی

گھر والوں کو اور گھر والوں کے مفہوم میں بیوی سب سے پہلے داخل ہے پس یہ احتمال نہیں ہوسکتا کہ ذریت تو آل میں داخل ہو اور ازواج داخل نہ ہوں۔ بعض لوگوں کو ایک حدیث سے شبہ ہوگیا ہے وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ حضرت علیؓ اور فاطمہؓ و حضرات حسنین رضی اللہ عنہم کو اپنی عبا میں داخل فرماکر فرمایا اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اَھْلُ بَیْتِیْ کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں اس سے بعض عقلمندوں نے یہ سمجھا ہے کہ ازواج مطہرات اہل بیت میں داخل نہیں۔ حالانکہ حدیث کا مطلب ہے کہ اے اللہ یہ بھی میرے اہل بیت میں سے ہیں ان کو بھی اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا [1] کی فضیلت میں داخل کر لیا جائے یہاں حصر مقصود نہیں کہ بس یہی اہل بیت ہیں اور ازواج مطہرات اہل بیت نہیں ہیں۔ اور یہ جو اس حدیث کے بعض طرق میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو عبا میں داخل فرماکر یہ دعا کی تو ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے بھی ان کے ساتھ شامل فرمالیجئے تو آپؐ نے فرمایا کہ تم اپنی جگہ ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کو عبا میں داخل کرنیکی ضرورت نہیں تم تو پہلے ہی سے اہل بیت میں داخل ہو۔ دوسرے حضرت علیؓ حضرت ام سلمہؓ سے اجنبی تھے ان کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ کو عبا میں کیونکر داخل کیا جاسکتا تھا یہ تو اشکالات کا جواب تھا۔ اور اصل مدعا کے لئے دلیل اول تو لغت ہے کہ آل محمد میں ازواج اولاً داخل ہیں دوسرے قرآن کا محاورہ یہی ہے حق تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے واقعہ میں جبکہ ملائکہ نے ان کو ولد کی بشارت دی اور حضرت سارہؓ کو اس بشارت پر تعجب ہوا۔ ملائکہ کی طرف سے یہ قول نقل فرمایا ہے قَالُوْآ اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰہِ رَحْمَتُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ عَلَیْکُمْ اَھْلَ الْبَیْتِ اِنَّہٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ۔ ظاہر ہے کہ یہاں اہل بیت میں حضرت سارہ علیہا السلام یقیناً داخل ہیں کیونکہ خطاب انھیں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ اہل بیت میں ازواج بھی داخل ہیں۔ (النسوان فی رمضان ص۴)

(۴) اس شبہ کا جواب کہ بعض علوم سینہ بسینہ ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ سئل ھل خصکم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بشیئ دون الناس قال الا فھما اوتیہ الرجل فی القرآن او ما فی ھذہ الصحیفۃ

[1] اے اہل بیت اللہ تم سے چاہتا ہے کہ گندگی دور فرمادے اور تم خوب اچھی طرح پاک و صاف کردے۔

یعنی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ حضرات (اہل بیت) کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ خاص باتیں دوسروں سے الگ بتائی ہیں۔ فرمایا نہیں مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کسی کو قرآن کا فہم (خاص درجہ میں) عطا فرماویں (تو وہ دوسروں سے زیادہ صاحب علوم ہوجائے گا) یا وہ چند باتیں جو اس صحیفہ میں ہیں۔ اس کو دیکھا گیا تو اس میں دیت وغیرہ کے کچھ احکام تھے جو حضرت علیؓ کے ساتھ مخصوص نہ تھے بلکہ دوسرے صحابہؓ کو بھی اس کا علم تھا مقصود اس سے نفی کرنا تھا تخصیص کی اس سے معلوم ہوا کہ فہم میں تفاوت ہوسکتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک شخص کو قرآن سے وہ علوم حاصل ہوں گے جو دوسروں کو حاصل نہیں حضرت علیؓ کو چونکہ قرآن سے خاص مناسبت تھی اس لئے ان کو بعضے دوسروں سے زیادہ قرآن کے علوم حاصل تھے۔ شاید اس سے بعض لوگوں کو یہ شبہ ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو کچھ باتیں دوسروں سے الگ بتلائی ہیں یا کسی نے اڑائی ہو یہ خیال اسی وقت سے لوگوں میں پیدا ہوگیا کہ بعض علوم سینہ بسینہ ہیں۔ یہ خیال کتاب اور حدیث میں نہیں۔

سینہ بسینہ علم کا موجد یہ خیال عبداللہ بن سبا بانی فرقہ سبائیہ نے ایجاد کیا ہے۔ جس سے مقصود اس کا اسلام کا استیصال تھا کیونکہ عبداللہ بن سبا اول یہودی تھا پھر بطور نفاق کے مسلمان ہوا اور حضرت علیؓ کی محبت کا دم بھرنے لگا اور ان کے متعلق مسلمانوں میں غلط اعتقادات پھیلانے لگا کیونکہ وہ لوگ یہ سمجھ چکے تھے کہ تلوار سے اسلام کا خاتمہ نہیں ہوسکتا تو اب انھوں نے یہ تدبیر نکالی کہ احکام اسلام خلط کرنا چاہیئے اور اس کا ذریعہ یہ نکالا کہ بعض علوم کو سینہ بسینہ بتلایا مگر اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے دین کی خود حفاظت . . . کی ہے کہ احکام میں خلط نہیں ہوسکتا گو فرق ضالہ [1] اسلام میں بہت ہوئے ہیں اور اب بھی ہیں جن کے متعلق حدیث میں ہے کہ میری امت کے تہتّر فرقے ہوں گے اور یہ تہتّر تو اصول کے اعتبار سے ہیں ورنہ ہر فرقے کے اندر بہت سے فرقے ہوگئے ہیں۔ بلکہ آج کل تو ہر شخص ایک مستقل فرقہ ہے کیونکہ ہر شخص دین کے متعلق اپنی الگ رائے قائم کرتا ہے اور اس میں بھی حکمت ہے: تاکہ اس تفرق سے پریشانی نہ ہو کیوں کہ اختلاف تو ناگزیر تھا کسی قدر اختلاف تو ضرور ہوتا اس عالم میں بنائے حکمت یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی امر میں اختلاف نہ ہو اب اگر اختلاف کبھی کبھی ہوتا تو طالب حق کو تبعاً احتمال ہوسکتا تھا کہ نہ معلوم ان میں سے

[1] گمراہ فرقے۔

کون حق پر ہے۔ اور جب روزانہ نئے نئے فرقے نکلتے آتے ہیں تو اس کا اثر طبعاً کم ہو جائے گا اور دیکھئے گا کہ اختلاف کی تو کہیں انتہا ہی نہیں یہ تو روز کی دال روٹی ہو گئی کہاں تک ہر چیز کی تحقیق کیا کرے۔ بس وہ پرانا ہی طریقہ اسلم ہے بہرحال یہ خیال بالکل غلط ہے کہ بعض علوم سینہ بسینہ ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض علوم فہم عالی سے سمجھ میں آتے ہیں عقل متوسط یا ادنیٰ ان کے لئے کافی نہیں۔ (الارتیاب ص۴۲)

صوفیاء پر الزام

اور بعض لوگ صوفیہ کو بھی اس مضمون کے ساتھ بدنام کرتے ہیں کہ ان کے یہاں بھی کچھ علوم سینہ بسینہ ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے صوفیہ کے یہاں جو چیز سینہ بسینہ ہے وہ علوم نہیں علوم تو ان کے پاس وہی ہیں جو کتاب و سنت میں مذکور ہیں ہاں ایک بات ان کے یہاں سینہ بسینہ ہے یعنی نسبت اور طریق سے مناسبت اور یہ وہ چیز ہے جو ہر علم میں سینہ بسینہ ہی ہے حتیٰ کہ بڑھئی اور باورچی کے پیشے میں بھی مناسبت اور مہارت جس کا نام ہے وہ سینہ بسینہ ہی ہے یعنی یہ بات استاذ کے پاس رہنے سے حاصل ہو سکتی محض کتاب پڑھ لینے یا زبانی طریقہ سے دریافت کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ خوان نعمت ایک رسالہ چھپ گیا ہے جسمیں ہر قسم کے کھانوں کی ترکیب لکھدی ہے لیکن کیا اس کو دیکھ کر کوئی شخص باورچی بن سکتا ہے ہرگز نہیں جب تک کہ کسی پکانے والے کو پکاتا ہوا نہ دیکھے اور ایک دو بار کا دیکھنا کافی نہیں۔ بلکہ بار بار کا مشاہدہ شرط ہے۔

ایک حکایت

چنانچہ ایک عورت گلگلے پکار ہی تھی خاوند آئے اور کوئی کام بتلایا کہ تم فلاں کام کر لو۔ گلگلے میں پکا لوں گا۔ بیوی نے کہا کہ تم یہ کام نہیں کر سکتے اس نے کہا واہ یہ بھی کوئی مشکل کام ہے کہ ڈالا اور نکال لیا۔ اس نے کہا بہت اچھا ابھی معلوم ہو جائیگا چنانچہ شوہر صاحب نے کھڑے کھڑے ہی اوپر سے گلگلے کو گھی میں ڈالدیا جس سے گھی کی چھینٹے گرم گرم اڑ کر ان کے بدن پر گرے اور بدن جل گیا چھالے پڑ گئے بیوی نے کہا میں نہ کہتی تھی کہ تم سے یہ کام نہ ہوگا وہ یہ سمجھے تھے کہ اس میں کیا مشکل بات ہے بس ڈالا اور نکال لیا جیسے گنگوہ کے ایک پیرجی کہا کرتے تھے کہ کھانا کیا مشکل ہے منہ میں رکھا اور نگل لیا اور چلنا کیا مشکل ہے قدم اٹھایا اور رکھدیا وہ ظالم بہت کھانا کھا جاتا تھا اور دن میں بہت مسافت طے کر لیتا تھا۔ مگر ان دو لفظوں سے کہیں کام چلتا ہے ذرا آپ تو ایسا کر کے دیکھیں حقیقت معلوم ہو جائے گی اسی طرح بجاری کا کام ایک دو بار دیکھنے سے نہیں آسکتا۔ بندر بھی تو بڑھئی کو دیکھ کر بڑھئی

بنا تھا مگر کیا گت بنی تھی اسی لئے کہتے ہیں ع کار بوزینہ نیست نجاری۔ غرض تصوف میں سینہ بسینہ ایک چیز ہے یعنی نسبت اور مناسبت اور مہارت اور ایک اور چیز ہے یعنی برکت جو مشاہدہ سے معلوم ہو گی بدون مشاہدہ کے اس کا علم نہیں ہو سکتا جیسے نابالغ کو لذت جماع قبل البلوغ کے معلوم نہیں ہو سکتی۔

ایک مشہور قصہ

ایک قصہ مشہور ہے کہ چند سہیلیوں نے مل کر آپس میں تذکرہ کیا کہ شادی کی لذت کیسی ہوتی ہے ایک لڑکی نے کہا کہ میرا نکاح . . . . . ہو جائے تو میں بتلاؤں گی جب اس کا نکاح ہو گیا تو ساتھنوں نے اس سے پوچھا کہ اب بتلاؤ اس نے جواب دیا کہ ؎

بیاہ یوں ہی جب تمہارا ہو جائے گا ۔۔۔ تب مزا معلوم سارا ہو جائے گا

غرض امور ذوقیہ کو عبارت میں بیان نہیں کر سکتے وہ مشاہدہ ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں اسی طرح برکت بھی مشاہدہ ہی سے معلوم ہوتی ہے اس کے بغیر نہیں معلوم ہو سکتی پس جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو کچھ علوم سینہ بسینہ عطا ہوئے ہیں۔ وہ احکام میں خلط کرنا چاہتے ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس خیال کی تردید خود فرما دی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا ہے۔ الافهما اوتيه الرجل في القرآن کہ ہاں ایک چیز تو سینہ بسینہ ہے کہ انسان کو قرآن کا خاص فہم عطا ہو جاتے اس میں قرآن سے مراد تمام شریعت الٰہیہ ہے جیسا ایک حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس دو شخص آئے اور انھوں نے کہا اقض بيننا بكتاب الله کہ ہمارے درمیان کتاب اللہ سے فیصلہ کر دیجئے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کے لئے رجم کا حکم دیا۔ مرد کے لئے سو درے اور جلا وطنی کا، حالانکہ رجم کا حکم قرآن میں نہیں ہے تو یہاں بھی کتاب اللہ سے مراد شریعت الٰہیہ ہے کیونکہ تمام احکام شرعیہ کتاب اللہ ہی کی طرف راجع ہیں۔ کلیتاً یا جزئیاً۔ چنانچہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بعض احکام حدیث کو قرآن کا مدلول فرما کر یہ آیت پیش کی مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا اور یہی فہم ہے جس کا اختلاف بعض اوقات اس درجہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کو حدیث معلوم ہے مگر اس کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس حدیث سے فلاں مسئلہ مستنبط ہوتا ہے۔

امام ابو یوسفؒ کا واقعہ چنانچہ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ایک محدث کے ساتھ جو کوفہ کے بہت بڑے محدث ہیں مشہور ہے کہ محدث نے امام ابو یوسف رحؒ سے سوال کیا کہ تمہارے استاذ امام ابو حنیفہ رحؒ نے حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا خلاف کیوں کیا۔ امام ابو یوسف رحؒ نے کہا کس مسئلہ میں۔ کہا ابن مسعود رضی اللہ عنہٗ کا فتویٰ ہے کہ باندی کی بیع طلاق ہے (یعنی جو باندی کسی کے نکاح میں ہو اگر مالک اس کی بیع کسی دوسرے شخص کے ہاتھ کر دے تو بیع ہوتے ہی باندی پر طلاق ہو جائے گی) اور امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ باندی کی بیع طلاق نہیں۔ امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ تم ہی نے تو ہم سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث بیان کی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیع جاریہ کو طلاق نہیں قرار دیا۔ محدث نے کہا کہ میں نے ایک یہ حدیث بیان کی۔ کہا تم نے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی یہ حدیث ہم سے بیان کی ہے جب کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بریرہ کو خرید کیا اور آزاد کیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بریرہ کو اختیار دیا کہ خواہ اپنا نکاح شوہر سابق سے برقرار رکھیں یا فسخ کر دیں۔ تو اگر بیع جاریہ سے ہی طلاق واقع ہو جایا کرتی تو اختیار دینے کے کیا معنیٰ؟ محدث سوچنے لگے اور کہا اے ابو یوسفؒ کیا یہ مسئلہ اس حدیث میں ہے۔ کہا ہاں۔ محدث نے کہا وَاللّٰہِ اَنْتُمُ الْاَطِبَّاءُ وَنَحْنُ الصَّیَادِلَۃُ بخدا تم طبیب ہو اور ہم عطار ہیں (صاحبو!) فقہاء کے بیان کے بعد تو ہم بھی سمجھتے ہیں کہ فلاں حدیث سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا اور فلاں آیت سے وہ مسئلہ مگر بدون بیان فقہا کے اس کا سمجھنا دشوار اور سخت دشوار ہے اسی کا نام اجتہاد ہے اور یہی وہ فہم ہے جس کو حضرت علی رضی اللہ عنہٗ نے فرمایا ہے۔ اِلَّا فَہْمًا اُوْتِیَہُ الرَّجُلُ فِی الْقُرْآنِ (ایضاً ص۷)

اہل بدعت کے شبہات کے جوابات
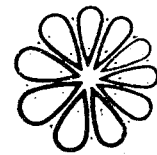
۵- بدعت کی ایک پہچان اور اس کی صحیح حقیقت

ایک پہچان بدعت کی بتلائے دیتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جو بات قرآن و حدیث اور اجماع و قیاس چاروں میں سے کسی ایک سے بھی ثابت نہ ہو اور اس کو دین سمجھ کر کیا جاوے وہ بدعت ہے۔ اس کی پہچان کے بعد دیکھ لیجئے کہ ہمارے بھائیوں کے جو اعمال ہیں مثلاً عُرس کرنا، فاتحہ دلانا تخصیص اور تعین کو ضروری سمجھ کر ایصال ثواب کرنا وغیرہ وغیرہ جتنے اعمال ہیں کسی اصل سے ثابت نہیں ہیں۔ اور ان کو دین سمجھ کر کیا جاتا ہے یا نہیں اور اگرچہ خواص کا عقیدہ ان مسائل میں خراب نہیں، لیکن یہ فقہ حنفیہ کا مسئلہ ہے کہ خواص کے حق مستحسن امر سے جب کہ وہ مطلوب عند الشرع نہ ہو۔ عوام میں خرابی پھیلے تو خواص کو چاہیئے کہ اس امر کو ترک کر دیں۔ ہاں اگر وہ امر مطلوب عند الشرع ہو۔ اور اسمیں کچھ منکرات مل گئے ہوں تو منکرات کے مٹانے کی کوشش کریں گے اور اس امر کو نہ چھوڑیں گے مثلاً اگر جنازہ کے ساتھ منکرات بھی ہوں تو مشایعت[1] جنازہ کو ترک نہ کریں گے کیونکہ مشایعت جنازہ کی مطلوب عند الشرع ہے پس ایصال ثواب میں دو امر ہیں ایک تعین وقت دوسرا ایصال ثواب، اور ان میں تعین وقت مطلوب عند الشرع نہیں اگرچہ مباح ہے۔ اور چونکہ تعین سے عوام میں خرابی پھیلتی ہے اس لئے ہم تعین کو ترک کر دیں گے البتہ اگر ساری امت کا یہ عقیدہ ہو جائے کہ وہ تعین کو ضروری نہ سمجھے تو ہم خواص کو بلکہ سب کو تعین کی اجازت دیدیں گے لیکن حالات موجودہ میں جب کہ اکثروں کا خیال ہے کہ خاص تاریخوں میں ثواب پہنچانے سے زیادہ مقبولیت ہوتی ہے اور یہ خلاف شریعت ہے۔ کیسے اجازت دیدی جائے۔

ایصال ثواب کے لئے تاریخ مخصوص کرنا ایک شخص نے مجھ سے کہا گیارہویں، اٹھارہویں تاریخ تک ہو سکتی ہے پھر نہیں ہو سکتی۔ ایک وعظ میں میں نے ان رسوم کا بیان کیا۔ بعد وعظ کے ایک صاحب کہنے

---

[1] پیچھے چلنا

لگے کہ علماء کو ایسے مضامین نہ بیان کرنے چاہئیں کہ تفریق امت ہوتی ہے میں نے کہا کہ ہمارا بیان کرنا تو آپ کے عمل کرنے پر موقوف ہے جیسے لوگوں کے اعمال اور حالات ہوں گے ویسا ہی ہم بیان کریں گے۔ اگر لوگ ان اعمال کو چھوڑ دیں گے تو ہم بھی اس قسم کے بیان کو چھوڑ دیں گے تو تفریق کا الزام ان اعمال کے ارتکاب کرنے والوں پر ہے نہ کہ ہم پر غرض یہ امور مطلوب عند الشرع نہیں اور ان سے خرابیاں بہت کچھ پھیل رہی ہے اس لئے ان کو ترک دینا چاہئے ایک تو تخصیص اور تعیین قابل ترک ہے۔ دوسرے جو ہیئات ایصال ثواب کی اختراع کر رکھی ہے وہ قابل ترک ہے۔ مجھ سے ایک دیہاتی کہنے لگا کہ اگر ایصال ثواب کے وقت کھانے پر چند سورتیں پڑھ لی جائیں تو ہرج ہی کیا ہے میں نے جواب دیا کہ جس مصلحت سے کھانے پر سورتیں پڑھی جاتی ہیں کبھی روپے یا کپڑے پر کیوں نہیں پڑھی جاتی۔

نیت کی اصلاح

اور ایک نیت میں اصلاح کرنی ضروری ہے کیونکہ اکثر یہ نیت ہوتی ہے ہم ان کو ثواب پہنچائیں گے تو ان سے ہمارے دنیا کے کام نکلیں گے تو صاحبو قطع نظر فساد اعتقاد کے اس کی ایسی مثال ہے کہ آپ کسی شخص کے پاس ہدیۃً مٹھائی لے جائیں اور پیش کرنے کے بعد اس شخص سے کہیں کہ آپ میرے مقدمہ میں گواہی دیدیں اندازہ کیجئے یہ شخص کس قدر کبیدہ ہوگا اور اس سے اس کو کیسی اذیت ہوگی۔ پس جب اہل دنیا کو اذیت ہوتی ہے تو اہل اللہ کو اس سے زیادہ اذیت ہوگی پھر خصوصاً وفات کے بعد لطافت زیادہ بڑھ جاتی ہے کیونکہ یہ قفس عنصری لوٹ جاتا ہے۔ اور صرف روح ہی روح رہ جاتی ہے اور اس کا ادراک کامل ہو جاتا ہے پس جس وقت ان کو یہ معلوم ہوتا ہوگا کہ یہ ہدیہ اس غرض سے پیش کیا گیا ہے کس قدر ناگواری ہوتی ہوگی اس کے ماسوا کس قدر شرم کی بات ہے کہ اہل اللہ سے دنیا کے لئے تعلق اور محبت ہو۔ صاحبو! ان کے پاس دنیا کہاں ہے ان سے دنیا کی امید رکھنی ایسی بات ہے جیسے کسی سنار سے کھرپا بنانے کی امید رکھنی یا کسی حکیم سے یہ فرمائش کرنی کہ تم چل کر ہمارے گھر کی گھاس کھود دو۔ صاحبو! ہم کو حضرت غوث الاعظم رحمۃ اللہ علیہ سے جو محبت ہے تو اس لئے کہ انہوں نے ہم کو راہ ہدایت دکھلائی۔ اس کے مکافات میں ہم ان کو کچھ ثواب بخش دیں کہ ان کی روح خوش ہو اور اس کے خوش ہونے سے خدا تعالیٰ خوش ہوں۔ اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ہم لوگ ایصال ثواب سے منع نہیں کرتے بلکہ اس کی اصلاح کرتے ہیں اور جس دن اصلاح عام ہو جائے گی اس دن ہم یہ بھی نہ کہیں گے مگر جب تک اصلاح نہ ہو اس وقت تک ہم ضرور لایجوز

کہتے رہیں گے۔ رہی بدنامی سو بحمد اللہ اشاعت دین میں ہم کو اس کی مطلق پرواہ نہیں ہے ہمارا مذہب ہے ؎

ساقیا برخیز و در دہ جام را | خاک بر سر کن غم ایام را
گرچہ بدنامیست نزد عاقلاں | مانمی خواہیم ننگ و نام را

(تقویم الزیغ ص ۲۹)

بدعت کی مثال

(ب) بدعت کے بارے میں فرمایا کہ کوئی ظہر کی چار رکعت کے بجائے پانچ رکعت پڑھ لے تو اس کی وہ چار رکعت بھی نہ ہونگی حالانکہ وہ کہہ سکتا ہے کہ میں نے کوئی برا کام تو کیا ہی نہیں نماز ہی پڑھی ہے بلکہ اور اچھا ہے کہ چار رکعت کے بجائے پانچ پڑھیں پھر نماز کیوں نہ ہوئی بات یہ ہے کہ اس نے خلاف ضابطہ کام کیا۔ اس لئے چار رکعت بھی گئی گذری ہوئیں جیسے لفافہ پر کوئی بجائے ڈاک کے دو پیسہ کے ٹکٹ کے کورٹ فیس کا ٹکٹ آٹھ آنے کا لگا دے تو خط بیرنگ ہو جائے گا وہ کہہ سکتا ہے۔۔۔ کہ میں نے بجائے دو پیسے کے آٹھ آنے صرف کئے اور پھر بھی بیرنگ ہو گیا لیکن چونکہ اس نے ٹکٹ کا استعمال بے محل اور خلاف ضابطہ کیا اس لئے آٹھ آنے کا ٹکٹ ضائع ہو گیا اسی ٹکٹ کو اپنے موقع پر یعنی عدالت میں لگاتا تو کام کا ہوتا اسی طرح ان پانچ رکعتوں کو سمجھ لیجئے مگر ان پانچ رکعتوں کے نہ ہونے میں کوئی شبہ نہیں کرتا۔ لیکن اور بدعتوں کو ایسا نہیں سمجھتے۔ اس میں شبہ کرتے ہیں کہ صاحب یہ تو نیک کام ہیں ان میں کیا برائی ہے۔

حضرت گنگوہیؒ کا واقعہ

ایک شخص نے نقل کیا کہ حضرت مولانا گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ تو لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کہنے سے روکتے ہیں بعد کو تحقیق ہوا کہ اذان کے آخر میں جو لا الٰہ الا اللہ موذن کہتا ہے اس کے جواب کے بعد اکثر ناواقف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ لیتے ہیں حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ اذان کا جواب کلمات اذان ہی ہیں دینا چاہیئے چنانچہ بعد کلمہ اخری لا الٰہ الا اللہ کے چونکہ موذن محمد رسول اللہ کہتا نہیں ہے۔ اس لئے صرف لا الٰہ الا اللہ کہہ کر جواب بھی ختم کر دینا چاہیئے یہ مقصود تھا حضرت مولانا گنگوہی رح کا اس کو اس صورت میں پیش کیا گیا کہ صاحب وہ تو کلمہ میں محمد رسول اللہ کہنے سے منع کرتے ہیں (نعوذ باللہ) اذان کا دین ہونا ظاہر ہے اس کے احکام میں اپنی طرف سے زیادتی کرنا بھی بدعت ہے۔ اسی طرح ساری ممنوع بدعتیں دین کی یکساں ہیں فرق کوئی وجہ نہیں۔

(مقالات حکمت دعوات عبدیت حصہ سوم ص)

بدعات کی قباحت

(ج) بدعت کے قبح کا یہی راز ہے مگر اس میں غور کیا جائے تو پھر بدعت کے منع میں تعجب نہ ہو۔ روزمرہ میں اس کی مثال دیکھئے اگر کوئی صاحب مطبع گورنمنٹ کے قانون کو طبع کرے اور اخیر میں ایک دفعہ کا اضافہ کر دے اور وہ ملک و سلطنت کے لئے بھی بیحد مفید ہو تب بھی اس کو جرم سمجھا جائیگا اور یہ شخص مستوجب سزا ہوگا پس جب قانون دنیا میں ایک دفعہ کا اضافہ جرم ہے تو قانون شریعت میں ایک دفعہ کا اضافہ جس کو اصطلاح شریعت میں بدعت کہتے ہیں کیوں جرم نہ ہوگا تو اگر کوئی اس طرح سے گوشت وغیرہ کو ترک کرے گا تو بلا شبہ جرم ہوگا لیکن ان حضرات نے ایسا نہیں کیا بلکہ محض علاج کے طور پر ترک کیا ہے بخلاف اس وقت کے جہلاء کے کہ وہ اس کو دین اور عبادت اور ذریعۂ قرب سمجھ کر کرتے ہیں (احسان التدبیر ص ۱۲)

خیر القرون کے بعد کی چیزیں

(د) پس جاننا چاہیئے کہ بعد خیر القرون کے جو چیزیں ایجاد کی گئی ہیں ان کی دو قسمیں ہیں ایک تو وہ کہ ان کا سبب داعی بھی جدیدہ ہے اور وہ موقوف علیہ کسی ماموربہ[1] کی ہیں کہ بغیر ان کے اس ماموربہ پر عمل نہیں ہو سکتا جیسے کتب دینیہ کی تصنیف اور تدوین۔ مدرسوں اور خانقاہوں کی بنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ان میں سے کوئی شیٔ نہ تھی اور سبب داعی ان کا جدید ہے اور نیز یہ چیزیں موقوف علیہ ایک ماموربہ کی ہیں تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ دین کی حفاظت سب کے ذمہ ضروری ہے اس کے بعد سمجھئے کہ زمانہ خیریت نشانہ میں دین کی حفاظت کے لئے وسائط محدثہ میں سے کسی شی کی ضرورت نہ تھی۔ تعلق مع اللہ یا بلفظ آخر نسبت سلسلہ سے بہ برکت حضرت نبوت سب مشرف تھے۔ ۔ ۔ قوت حافظہ اس قدر قوی تھی کہ جو کچھ سنتے تھے وہ سب نقش کالحجر ہو جاتا تھا فہم ایسی عالی پائی تھی کہ اس کی ضرورت ہی نہ تھی کہ سبق کیطرح ان کے سامنے تقریر کریں۔ ورع[2] و تدین بھی غالب تھا۔

کتابوں کی تصنیف اور مدارس و خانقاہوں کی تعمیر

بعد اس زمانہ کے دوسرا زمانہ آیا غفلتیں بڑھ گئیں قوی کمزور ہو گئے ادھر اہل اہوا اور عقل پرستوں کا غلبہ ہوا تدین مغلوب ہونے لگا پس علماء امت کو

لہ جس کا حکم دیا گیا ہو۔ لہ پرہیزگاری۔

قوی اندیشہ دین کے ضائع ہونے کا ہوا۔ پس ضرورت اس کی واقع ہوئی کہ دین کی تجمیع اجزا و تدوین کی جائے۔ چنانچہ کتب دینیہ حدیث۔ اصول حدیث فقہ۔ اصول فقہ۔ عقائد میں تصنیف ہوئیں اور ان کی تدریس کے لئے مدارس تعمیر کئے گئے۔ اسی طرح نسبت سلسلہ کے اسباب تقویت و ابقاء کے لئے بوجہ عام رغبت نہ رہنے کے مشائخ نے خانقاہیں بنائیں۔ اس لئے کہ بغیر ان چیزوں کے دین کی حفاظت کی کوئی صورت نہ تھی پس یہ چیزیں وہ ہوئیں کہ سبب ان کا جدید ہے کہ وہ سبب خیر القرون میں نہ تھا۔ اور موقوف علیہ حفاظت دین ماموربہ کی ہیں پس یہ اعمال گو صورتاً بدعت ہیں لیکن واقعہ میں بدعت نہیں بلکہ حسب قاعدہ مقدمۃ الواجب واجب واجب ہیں۔

بدعات میں کیا چیز داخل ہیں

اور دوسری قسم وہ چیزیں ہیں جن کا سبب قدیم ہے جیسے مجالس میلاد مروجہ اور تیجہ، دسواں چہلم وغیرہا من البدعات کہ اس کا سبب قدیم ہے مثلاً میلاد کے منعقد کرنے کا سبب فرح علی الولادۃ النبویہ ہے اور یہ سبب حضور کے زمانے میں موجود تھا لیکن حضور نے یا صحابہؓ نے یہ مجالس منعقد نہیں کیں۔ کیا (نعوذ باللہ) صحابہؓ کا فہم یہاں تک نہیں پہنچا۔ اگر سبب اس کا اس وقت نہ ہوتا تو البتہ یہ کہہ سکتے تھے کہ منشا ان کا موجود نہ تھا لیکن جبکہ باعث اور بنا اور مدار موجود تھا تو پھر کیا وجہ ہے کہ نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی مجلس میلاد منعقد کی اور نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے۔ پس جس شیٔ کو باوجود اس بنا اور مدار کی موجودگی کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا نہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے ایسی شیٔ کا حکم یہ ہے کہ وہ بدعت صورتاً بھی اور معنیً بھی اور حدیث مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا هٰذَا مَالَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ[1] (مشکوٰۃ) میں داخل ہو کر واجب الرد ہے۔ اور پہلی قسم مامنہ میں داخل ہو کر مقبول ہے یہ قاعدہ کلیہ ہے بدعت اور سنت کے پہچاننے کا اس سے تمام تر جزئیات کا حکم مستنبط ہو سکتا ہے اور ان دو قسموں میں ایک اور فرق عجیب ہے کہ پہلی قسم کے تجویز کرنے والے خواص یعنی علماء ہوتے ہیں اور اس میں عوام تصرف نہیں کرتے اور دوسری قسم کے تجویز کرنے والے عوام کالانعام ہوتے ہیں۔ اور وہی اس میں ہمیشہ تصرفات کیا کرتے ہیں چنانچہ مولود شریف کی مجلس کو ایجاد ایک بادشاہ نے کیا ہے کہ اس کا شمار عوام ہی میں ہے۔ اور عوام ہی اب تک اسمیں شرکت بھی کرتے ہیں۔ (السرور ص ۲۷)

لہ جس نے ہمارے دینی امور میں کوئی نئی چیز پیدا کی جن کا دین سے تعلق نہیں وہ مردود ہیں۔

(۶) اہل حق کو وہابی کہنا محض بہتان ہے

اہل بدعت کی جماعت ہے جو ہم لوگوں کو وہابی کہتی ہے لیکن ہماری سمجھ میں آج تک یہ بات نہ آئی کہ ہم کو کس مناسبت سے وہابی کہا گیا کیونکہ وہابی وہ لوگ ہیں جو ابن عبدالوہاب کی اولاد میں ہیں یا اس کے متبع ہیں۔ ابن عبدالوہاب کے حالات مدوّن ہیں۔ ہر شخص ان کو دیکھ کر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ نہ اتباع کی رو سے ہمارے بزرگوں میں ہیں نہ نسب کی رو سے۔ البتہ آج کل جن لوگوں نے تقلید کو ترک کر دیا ہے ان کو ایک اعتبار سے وہابی کہنا درست ہو سکتا ہے کیونکہ ان کے اکثر خیالات ابن عبدالوہاب سے ملتے جلتے ہیں۔ البتہ ہم لوگوں کو حنفی کہنا چاہیئے کیونکہ یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اصول چار ہیں۔ کتاب اللہ، حدیث رسول، اجماع امت، قیاس مجتہد، سوا ان چار کے اور کوئی اصل نہیں۔ اور مجتہد اگرچہ متعدد ہیں لیکن اجماع امت سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ائمہ اربعہ (یعنی امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام مالک بن انس کے مذہب کے باہر ہونا جائز نہیں۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ ان چاروں میں جس کا مذہب راجح ہو، اس کا اتباع کرنا چاہیئے تو چونکہ ہندوستان میں امام ابوحنیفہؒ کا مذہب راجح ہے اس لئے ہم انھیں کا اتباع کرتے ہیں ہم لوگ وہابی کے لقب سے بُرا نہیں مانتے۔ لیکن اتنا ضرور کہہ دیتے ہیں کہ قیامت میں اس بہتان کی بازپرس ضرور ہوگی۔ (تقویم الزیغ ص۲۹)

(۷) شیخ عبدالقادر جیلانی کی گیارہویں منانے والوں کی غلطیاں

اس روز لوگ حضرت غوث الاعظم سیدنا عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی گیارہویں مناتے ہیں اول تو لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا[1] سے اس کا بھی رد ہو گیا کیونکہ مثل یوم المیلاد وغیرہ کے یہ دن بھی متبدل ہو گیا جب غیر متبدل یعنی قبر نبویؐ کا عید بنانا حرام ہے تو متبدل یعنی بڑے

[1] میری قبر کو میلہ نہ بنانا

پیر صاحب کی گیارہویں کا عید بنانا کیسے جائز ہوگا۔ دوسرے یہ تاریخ حضرت کے وفات کی کسی مورخ نے نہیں لکھی، نہ معلوم عوام نے گیارہویں تاریخ کس کشف والہام سے معلوم کر لی۔ بعض لوگ ایک روایت نقل کرتے ہیں کہ حضرت غوث الاعظم خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں کیا کرتے تھے تو اول تو یہ روایت ثابت نہیں اس کا ثبوت دینا چاہیئے دوسرے اگر ہو بھی تو کیا حضرت غوث الاعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر کرتے ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی گیارہویں چھوڑ کر بڑے پیر صاحب کی گیارہویں کرتے ہو یہ تو ان کے خلاف ہے کیونکہ اگر بالفرض وہ رسول اللہ ﷺ کی گیارہویں کیا کرتے تھے تو وہ اس کو وہ ہرگز گوارا نہ کر سکتے تھے کہ میرے بعد بجائے رسول اللہ ﷺ کے میری گیارہویں کی جائے۔ تیسرے اس میں عقیدہ بھی فاسد ہے کہ لوگ حضرت غوث الاعظم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر سمجھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا میلاد کرتے ہیں تو بڑے پیر کی گیارہویں بلکہ بعض جگہ حضرت غوث الاعظم کا میلاد بھی ہونے لگا گویا بالکل ہی رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مساوی ہو گئے۔

عقائد کی خرابیاں

اور غضب یہ ہے کہ کرنے والوں کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ اگر گیارہویں نہ کریں گے تو بلا نازل ہو گی بڑے پیر صاحب ناخوش ہو جائیں گے اور پھر نہ معلوم کیا سے کیا کر دیں گے۔ گویا نعوذ باللہ وہ مخلوق کو تکلیف دیتے پھرتے ہیں نیز گیارہویں کرنے کو مال واولاد کی ترقی کا باعث سمجھتے ہیں۔ اس میں حضرت غوث الاعظم کے ساتھ دنیا کے لئے تعلق رکھنا ہوا، یہ کیسی بے حیائی ہے کہ جس مردار کو وہ چھوڑ کر الگ ہوئے تھے۔ اسی کے لئے اُن سے تعلق کیا جائے غرض گیارہویں کے اندر بھی عملی و اعتقادی بہت سی خرابیاں ہیں اس کو چھوڑنا چاہیئے اگر کسی کو حضرت غوث الاعظم کے ساتھ محبت کا دعویٰ ہو تو کچھ قرآن پڑھ کر ان کی روح کو ثواب بخش دیا جائے۔ یا بلا تعیین تاریخ غربا کو کھانا کھلا دے۔ (الحبور ص۳۲)

(۸) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے متعلق ایک بے بنیاد حکایت

ایک حکایت مشہور کی جاتی ہے کہ آپ کے پاس ایک بڑھیا آئی جس کا لڑکا مر گیا تھا۔

کہ حضرت اس کو زندہ کر دو، آپ نے فرمایا کہ اس کی عمر تو ختم ہو چکی اب زندہ نہیں ہو سکتا۔ وہ رونے اور اصرار کرنے لگی تو آپ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور عرض کیا کہ اس لڑکے کو زندہ کر دیا جائے وہاں سے خطاب ہوا کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں، اس لئے اب زندہ نہیں ہو سکتا، تو حضرت غوث اعظم حق تعالیٰ سے کہتے ہیں ذرا ملاحظہ کیجئے۔ یہ حق تعالیٰ سے باتیں ہو رہی ہیں کہ حضرت آپ سے کہنے کی تو اس لئے ضرورت ہوئی کہ اس کی تقدیر میں اور حیات نہیں اور اس کی تقدیر میں کچھ اور زندگی ہوتی تو آپ سے کہنے کی کیا ضرورت تھی، پھر تو آپ مجبور ہو کر خود ہی زندہ کرتے (نعوذ باللہ منہ) وہاں سے حکم ہوا کہ پھر تقدیر کے خلاف تو نہیں ہو سکتا اس پر غوث اعظم کو جلال آیا، اور آپ نے قوت کشفیہ سے ملک الموت کو ٹٹولا کہ وہ کہاں ہیں آخر نظر آئے تو دیکھا کہ ایک تھیلے میں اس دن کے مُردوں کی روحیں بھر کر لے جا رہے ہیں ابھی تک ہیڈ کوارٹر نہ پہنچے تھے کہ غوث اعظم نے ان کو ٹوکا اور کہا کہ بڑھیا کے لڑکے کی روح واپس کر دو۔ تم اس کو نہیں لیجا سکتے، وہ انکار کرنے لگے۔ آپ نے وہ تھیلا ان کے ہاتھ سے چھین کر کھول دیا۔ جتنی روحیں تھیں سب پھر پھر اڑ گئیں اور اس دن جتنے مردے مرے تھے سب زندہ ہو گئے، تو غوث اعظم نے حق تعالیٰ سے کہا کہ کیوں اب راضی ہو گئے ایک مُردے کے زندہ کرنے پر راضی نہ ہوئے اب بہت جی خوش ہوا ہو گا۔ جب ہم نے سارے مردوں کو زندہ کر دیا توبہ توبہ۔ استغفر اللہ۔ کیا خدا تعالیٰ کے ساتھ اس طرح گفتگو کرنے کی کسی کو مجال ہے۔ مگر یہ سب حکایتیں جاہلوں نے گھڑی ہیں اور ان کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ نعوذ باللہ غوث اعظم وہ کام کر سکتے ہیں جو خدا بھی نہیں کر سکتا۔ بھلا کچھ ٹھکانا ہے اس کفر کا جب جاہلوں نے غوث اعظم کو اس مرتبہ پر پہنچا دیا۔ تو اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت آثار طبعیہ اور لوازم بشریہ کو ذکر نہ کیا جاتا۔ تو نہ معلوم یہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کہاں پہونچا تے۔

(فناء النفوس فی رضاء القدوس ص ۸)

(۹) بعض لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا ہونے کی حدیثیں گھڑلی ہیں

بعض لوگوں نے اس مضمون کی احادیث بھی گھڑی ہیں جن سے معاذ اللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

کا خدا ہونا ثابت کیا ہے چنانچہ ایک حدیث یہ گھڑی ہے اَنَا عَرَبٌ بِلَا عَيْنٍ اس کے الفاظ ہی بتلا رہے ہیں کہ کسی جاہل نے فرصت میں بیٹھ کر گھڑی ہے۔ بھلا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس چیستان کی کیا ضرورت تھی، آپ نے صاف ہی کیوں نہ فرما دیا۔ انا رب ہیر پھیر کے ساتھ انا عرب بلا عین کہنے کی کیا ضرورت تھی، پھر اس سے مدعا کیونکر حاصل ہوا۔ کیونکہ عربؑ میں با مشدد نہیں ہے مخفف ہے تو عین نکال کر ربَ بلا تشدید باقی رہا اور یہ کوئی لغت نہیں ہے۔ رب بالتشدید ثابت نہ ہو دوسرے آپ عرب کہاں تھے آپ تو عربی تھے پھر انا عرب میں حمل کیونکر صحیح ہوگا۔ حدیث ہی گھڑی تو ایسی جس کے سر نہ پاؤں۔ جس میں ایک ادنیٰ طالب علم بھی غلطیاں نکال سکتا ہے۔ حالانکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایسے فصیح و بلیغ تھے کہ آپ کے کلام میں کسی کی مجال نہیں کہ انگلی بھی دھر سکے اسی لئے محدثین نے فرمایا ہے کہ رکاکت الفاظ بھی حدیث کے موضوع ہونیکی علامت ہے اور یہاں تو رکاکت الفاظ کے ساتھ مضمون بھی رکیک ہے کیونکہ اس سے ربٌّ ہونا نہیں نکلتا۔ بلکہ ربٌ نکلتا ہے۔ اور ربٌ بلا تشدید ایک مہمل لفظ ہے، ایک حدیث یہ گھڑی ہے۔ اَنَا اَحْمَدُ بِلَا مِيْمٍ یہ حدیث نہیں ہے بلکہ احمد جام رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جو ان سے حالت سکر[1] میں صادر ہوا اور قابل تاویل ہے اور اگر تاویل نہ کی جاوے تو قابل رد ہے کیونکہ غلبہ حال کے اقوال و افعال قابل اعتبار نہیں ہوتے ایک حدیث یہ گھڑی ہے۔ رَأَيْتُ رَبِّي يَطُوْفُ فِيْ سِكَكِ الْمَدِيْنَةِ[2] یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب ہے کہ انھوں نے آپ کو مدینہ کی گلیوں میں دیکھا تو فرمایا رایت ربی یطوف فی سکک المدینۃ کہ میں نے خدا کو مدینہ کی گلیوں میں گھومتے ہوئے دیکھا۔ بس پھر تو ہر صوفی خدا ہو گیا۔ جیسے ایک جاہل صوفی کہتا ہے نعوذ باللہ ع ۔

ع اللہ جسے کہتے ہیں واللہ میں ہی ہوں۔

جاہلوں کے خرافات

ان بیوقوفوں نے تصوف کو ان خرافات سے بدنام کر دیا۔ مخالفین بھی ان باتوں پر ہنستے ہیں۔ ایک انگریز ایک مسلمان سے کہتا تھا کہ ہم پر خدا کے تین کہنے پر اعتراض کرتا ہے تمہارا ٹوپی (صوفی) تو ہر چیز کو خدا کہتا ہے۔ یہ مسئلہ وحدۃ الوجود کا ناس مارا ہے ان جاہلوں نے اس کی حقیقت تو سمجھی نہیں۔ بس یہ سمجھے کہ ہر چیز کو خدا کہنے لگے ان ہی لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی بشریت سے نکالنے کی کوشش کی تھی حالانکہ واقعات اس پر یقینی شاہد ہیں کہ آپ بشر تھے چنانچہ اکل و شرب بول و براز سے آپ

---

[1] مستی و بے ہوشی [2] میں نے اپنے رب کو مدینہ کی گلیوں میں پھرتے ہوئے دیکھا

منزہ نہ تھے۔ جنگ اُحد میں کفار کے ہاتھ سے آپ زخمی ہوئے، یہود نے آپ پر سحر کیا۔ اور اس کا اثر ہو گیا۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام سے آپؐ نے درخواست کی کہ مجھے اپنی اصلی صورت میں دکھاؤ جب وہ اپنی اصلی صورت میں ظاہر ہوئے۔ تو آپؐ بے ہوش ہو گئے۔ (وعظ تحصیل المرام صفحہ ۱۱)

(۱۰) جانوروں وغیرہ کو منحوس سمجھنا سب واہیات ہے

ایک بار عرض کیا گیا کہ لوگ جو بعض گھوڑوں وغیرہ کو منحوس سمجھتے ہیں۔ اس کی بھی کوئی اصل ہے۔ فرمایا کہ جی نہیں۔ سب واہیات ہے اس پر تو میں ایک مثال دیا کرتا ہوں کہ کسی حبشی کو راہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا اٹھا کر دیکھا تو اپنی ہی صورت نظر پڑی اور اس آئینہ کا قصور سمجھا۔ اسی طرح ہم لوگوں کو اپنے عیوب دوسروں میں نظر آتے ہیں مصیبت تو آتی ہے اپنے معاصی کی نحوست سے اور اس کو منسوب کر دیتے ہیں بے گناہ جانور کی طرف کہ فلاں گھوڑا ایسا منحوس آیا۔ یا فلاں جانور فلاں وقت بول دیا اس لئے کام نہ ہوا اس پر عرض کیا گیا کہ حدیث شریف میں ہے کہ جب کوئی شگون بد دل میں کھٹکے تو فلاں دعا پڑھے، اس سے شبہ ہوتا ہے کہ جب اس میں کچھ اثر ہو۔ اور اس کے ازالہ کے لئے یہ دعا بتلائی گئی ہو فرمایا کہ یہ محض رفع تردد اور حصول اطمینان کے لئے ہے، اور اس سے کسی اثر کا اثبات لازم نہیں آتا۔ فال نیک لینے کی جو اجازت ہے اس کی بابت استفسار کیا گیا۔ فرمایا کہ وہ بھی موثر نہیں بلکہ فال نیک کا حاصل صرف یہ ہے کہ کوئی اچھی چیز پیش آئی اس کی بنا پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ گمان نیک رکھا کہ انشاء اللہ تعالیٰ میرا کام ہو جاویگا اور فال بد کو اگر اسی درجہ میں سمجھے تو اس کا حاصل یہ ہوگا کہ خدا تعالیٰ سے بدگمانی رکھے اور اللہ تعالیٰ پر گمان نیک رکھنا بہت اچھا ہے اور بدگمانی ناجائز ہے۔ اس لئے فال نیک کی اجازت ہوئی اور فال بد کی ممانعت۔ (مجاولت معدلت دعوات عبدیت حصہ سوم صفحہ ۱۳)

(۱۱) اصطلاح صوفیہ میں کافر سے مراد فانی ہے

علماء ظاہر تو امکان کذب ہی میں آج تک لڑ رہے ہیں اس میں تو وقوع کذب لازم آگیا اس کا جواب یہ ہے کہ نہیں کذب نہیں کیونکہ کافر باصطلاح صوفیہ بمعنی فانی ہے۔ خسرو فرماتے ہیں ؎

کافر عشقم مسلمانی مرا درکار نیست ہر رگ من تار گشتہ حاجت زنار نیست

اے فانی عشقم۔ تو اس غیبی آواز کا مطلب یہ ہوا کہ جو چاہے عمل کر تو فانی ہو کر مرے گا، اب یہ کلام ایسا ہو گیا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے لعل اللّٰہ اطلع الی اھل بدر فقال اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم اور صوفیہ نے یہ اصطلاح لغت سے لی ہے کیونکہ لغت میں کفر بمعنی ستر (چھپانا) ہے اور فانی بمعنی اپنی ہستی کا ساتر ہے صوفیہ کی اصطلاحات کہیں لغت سے ماخوذ ہیں کہیں عرف عام سے۔ کہیں فلسفہ سے، کہیں علم کلام سے۔ کہیں کسی اور فن سے۔ اور یہ خلط مبحث انھوں نے اس لئے کیا ہے تاکہ اس پر پردہ پڑا رہے۔ بل تک نہ پہونچ جائیں ؎

با مدعی مگوئید اسرار عشق و مستی بگذار تا بمیرد در رنج خود پرستی

اسی لئے ان علوم و اسرار کو برسر منبر بیان کرنے کی ممانعت ہے یعنی بلا ضرورت بیان نہ کرے اور میں اس وقت ضرورت سے بیان کر رہا ہوں۔ غرض یہ غیبی صدا صوفیہ کی اصطلاح میں تھی عام اصطلاح میں نہ تھی۔ اور یہ عنوان مزاح کے لئے اختیار کیا گیا۔ تاکہ ذرا تھوڑی دیر کو عاشق پریشان ہو جائے۔

مزاح حدیث میں

اور مزاح حدیث سے ثابت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بعض دفعہ مزاح فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک بڑھیا نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کی کہ اے اللہ تعالیٰ مجھے جنت میں پہنچا دے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لَا تَدْخُلُ الْعَجُوْزُ الْجَنَّۃَ کہ بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی۔ وہ رونے لگی تب آپ نے یہ آیت پڑھی اِنَّا اَنْشَأْنٰھُنَّ اِنْشَاءً فَجَعَلْنٰھُنَّ اَبْکَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا لِاَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ۔ مطلب یہ تھا کہ بوڑھی عورت بڑھیا ہو کر جنت میں نہ جائے گی بلکہ جوان ہو کر جائے گی۔ ایک بار حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ نے ایک مسئلہ کے متعلق بار بار سوال کیا۔ آپ نے ہر دفعہ جواب دیا پھر اخیر میں فرمایا۔ وَاِنْ رَغِمَ اَنْفُ اَبِیْ ذَرٍّ کہ ہاں یہی جواب ہے اگرچہ ابوذر کی ناک رگڑ جائے یہ مزاح ہی تو تھا۔ گو برنگ عتاب تھا مگر عاشق کو ایسا لطف آتا ہے کہ حضرت ابوذر جب اس حدیث کو بیان فرماتے تو اخیر میں یہ بھی کہتے وان رغم انف ابی ذر۔ وان رغم انف ابی ذر کیونکہ ان کو اس میں حظ۱؎ آتا تھا۔

ایک واقعہ

حضرت شیخ ابو المعالی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک مرید حج کو گیا۔ تو آپ نے اس کے ہاتھ روضۂ اقدس پر سلام بھیجا جب مرید نے شیخ کا سلام پہونچایا تو روضۂ اقدس سے

۱؎ مزہ۔

آوازا ٓئی۔ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہدینا شیخ کو یہ واقعہ مکشوف ہوگیا مگر جب مرید واپس آیا تو اس سے پوچھا کہو تم نے ہمارا سلام پہونچایا تھا۔ کہا ہاں حضور پہنچا دیا تھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی آپ کو سلام فرمایا ہے فرمایا انھیں لفظوں سے کہو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائے ہیں کہا جب آپ کو وہ الفاظ معلوم ہیں تو مجھے آپ کیوں بے ادب بناتے ہیں۔ فرمایا اس میں بے ادبی کیسی۔ اس وقت تمہاری زبان سے وہ الفاظ ادا نہ ہوں گے، بلکہ تمہاری زبان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک ہوگی۔ تم تو محض سفیر ہو غرض اس نے وہی الفاظ کہے کہ اپنے بدعتی پیر کو ہمارا بھی سلام کہنا۔ یہ سنتے ہی شیخ پر وجد طاری ہوگئی اور یہ شعر پڑھا۔ ؎

بدم گفتی و خورسندم عفاک اللہ نکو گفتی ۔۔۔ جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا

یہی راز تھا حضرت ابوذر کے بار بار وان رغم انف ابی ذر کہنے میں ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

اگر ایکبار بگوید بندۂ من ۔۔۔ از عرش بگذرد خندۂ من

(اگر وہ کہدے مجھے اپنا غلام ۔۔۔ سب سے پیارا نام ہو میرا یہی)

حق تعالیٰ کا مزاح

حق تعالیٰ کا مزاح فرمانا بھی حدیث سے ثابت ہے کہ جہنم سے جو مسلمان نکالے جائیں گے ان کا لقب جہنمین ہوگا۔ کیونکہ ان کو اسی میں حظ ہوگا۔ جس کی مثال اوپر گذر چکی۔ ان میں ایک شخص جو سب سے اخیر میں نکالا جائے گا حق تعالیٰ اس سے فرمائیں گے کہ مانگ کیا مانگتا ہے وہ عرض کریگا کہ میرا منہ جہنم کی طرف سے پھیر دیا جائے حق تعالیٰ فرمائیں گے بس اس کے بعد کچھ نہ مانگے گا وہ کہے گا نہیں اور کچھ نہ مانگوں گا۔ چنانچہ جہنم کی طرف سے اس کا منہ پھیر دیا جائے گا اس وقت اس کو جنت کا ایک درخت نظر آئے گا۔ عرض کرے گا اس درخت کے نیچے مجھے پہنچا دے۔ ارشاد ہوگا کہ تو نے تو ابھی وعدہ کیا تھا کہ کچھ نہ مانگونگا وہ معذرت کرنے لگے گا کہ بس یہ درخواست اور پوری کر دیجئے پھر کچھ نہ مانگوں گا غرض اسی طرح رفتہ رفتہ وہ جنت میں پہونچ جائیگا تو یہ بھی مزاح ہی ہے کہ مقصود تو جنت میں پہونچانا تھا مگر اس کو درگڑ کر پہونچایا جائے گا لہذا اب اس حکایت پر کچھ اشکال نہیں کیونکہ مزاح کا ثبوت اس میں بھی ہے۔ دوسرے ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کافر سے مراد صدائے غیبی میں کافر باللہ نہ تھا بلکہ کافر بالطاغوت ہے۔ اور یہ استعمال نص میں بھی وارد ہے۔ فمن یکفر بالطاغوت ویؤمن باللہ فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ۔ جس نے

طاغوت کا انکار کیا اور اللہ پر ایمان لایا اس نے مضبوط دستے کو تھام لیا۔

۱۲ خطبۃ الوداع محض بدعت ہے

خطبۃ الوداع میں مصلحتیں بیان کرنا من وجہ خدا اور رسول پر اعتراض ہے سو اس کا بیان یہ ہے کہ جب بعض بدعتیں بھی بوجہ مصالح مطلوب ہوئیں تو گویا اس شخص کے نزدیک کتاب و سنت کی تعلیم ناتمام ہوئی کہ بعض مصالح ضروریہ کی تعلیم میں فرو گذاشت ہوگئی کیا کوئی اس کا قائل ہوسکتا ہے، اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہر بدعت کو ضلالت فرمایا ہے۔ اور بعض بدعت کے حسنہ ہونے سے اگر شبہ ہو تو درحقیقت وہ بدعت ہی نہیں۔ اور اس قسم کا احتمال خطبۃ الوداع میں نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اگر یہ معنیً سنت ہوتا تو سلف میں اس کی نظیر ضرور ہوتی پھر بعد عرق ریزی کے اگر کوئی دور کی نظیر نکال بھی لی جاوے، تو دوسرے مانع کا کیا جواب ہوگا کہ عوام کے التزام سے بدعت ہوگیا اور بدعت بھی بدعت ضلالت، جس پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نار کی وعید فرما رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد عین ارشاد حق ہے، تو ایسے امر کا التزام اور اس میں مصلحتیں نکالنا خدا اور رسول پر اعتراض بھی ہے اور خدا اور رسول سے مزاح بھی ہے۔ لیکن ہمارے اس قول سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ارشادِ خداوندی ہے کوئی یہ نہ سمجھ جاوے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد نہ فرماتے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اجتہاد ضرور فرماتے تھے لیکن آپؐ کا اجتہاد موقوف رہتا تھا اگر وحی میں اس پر نکیر نہ ہوئی تب تو وہ حجت رہتا تھا کیونکہ سکوت اس کی تقریر پر دلالت کرتا ہے۔ ورنہ وحی سے اس کی اصلاح ہوجاتی تھی۔ غرض ہر حال میں وہ اجتہاد بھی حکماً وحی ہوجاتا تھا لہذا باوجود اجتہاد کے بھی یہ کہنا صحیح ہے کہ ؎

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ۔۔۔ گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود

(اکمال العوام والعید ص۶)

۱۳ عوام کا اہل قبور سے مدد مانگنا شرک سے خالی نہیں

(۴) فرمایا شرک جس کی نسبت وعید ہے۔ اِنَّ اللہَ لَا یَغفِرُ اَن یُّشرَکَ بِہٖ۔ اس کی تعریف

لہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ شرک کرنیکو بخشتا نہیں ہے۔

یہ ہے کہ کسی کو مستحق عبادت سمجھنا اور عبادت کہتے ہیں کسی کے سامنے نہایت تضرع وتذلل سے پیش آنے کو چونکہ حق تعالیٰ قادر مطلق وخالق ورازق ہیں، ان کو غیرت آتی ہے کہ سوا ان کے کسی دوسرے کے سامنے غایت تضرع وتذلل سے پیش آئے۔ مثلاً دو شخص ہوں۔ ایک ان میں بڑے مرتبے کا ہے اور اس مرتبے والے نے کسی سائل کو کچھ دیا۔ اور سائل بجائے معطی کے دوسرے کی ایسی ہی تعریف وتوصیف کرنے لگے جو اس کے لئے چاہیئے تھی تو طبعی بات ہے کہ معطی کس قدر غضبناک ہوگا۔ اسی طرح حق تعالیٰ کو بھی غیرت آتی ہے۔ جو لوگ مزارات پر اولیاء اللہ سے سوال کرتے ہیں اب دیکھنا چاہیئے آیا محض وسیلہ سمجھ کر سوال کرتے ہیں یا کوئی امر اس سے زائد ہے۔ سو مشرکین عرب بھی بتوں کی عبادت وسیلہ قرب الٰہی سمجھ کر کرتے ہیں چنانچہ مذکور ہے۔ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَا اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى [1] نہ خدا سمجھ کر مگر پھر بھی وہ مشرک قرار دیئے گئے۔ سو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ وسیلہ میں بھی دو [2] صورتیں ہیں۔ مثال سے فرق معلوم ہوگا۔

شرک کی ایک مثال

مثلاً ایک کلکٹر ہے اس کے پاس ایک منشی نہایت زیرک عاقل ہے کلکٹر نے اپنا سارا کاروبار حساب وکتاب اسی منشی کے سپرد کر دیا ہے اور اس کے ذمہ چھوڑ دیا۔ اور ایک دوسرا کلکٹر ہے اس کے پاس بھی منشی ہے مگر کلکٹر زبردست عادل ہے اپنا کاروبار خود دیکھتا رہتا ہے منشی کے ذمہ نہیں چھوڑا اب اگر کوئی شخص اس منشی زیرک کے پاس جو پہلے کلکٹر کے پاس ہے جس کے سپرد سب کام ہے کوئی درخواست پیش کرے تو کیا سمجھ کر کریگا یہ ظاہر ہے کہ منشی کو کاروبار میں دخیل سمجھ کر پیش کرے گا اور اسی واسطے اس کی خوشامد کرے گا کہ یہ خود سب کام کر دیں گے کیونکہ ان کے کل کام سپرد ہیں۔ کلکٹر تو فارغ بیٹھا ہے گو ضابطہ کے دستخط وہی کرے گا مگر اس منشی کے خلاف کبھی دستخط نہ کرے گا اور اگر دوسرے کلکٹر کے منشی کے یہاں عرضی دی جائیگی تو محض اس خیال سے کہ کلکٹر زبردست ہے۔ رعب والا ہے اس کے سامنے کون جا سکتا ہے اس منشی کے ذریعہ درخواست کرنی چاہیئے کیونکہ اس منشی کو تقرب حاصل ہے۔ یہ وہاں پیش کر دیگا۔ کیونکہ کل کام کلکٹر خود دیکھتا ہے۔ اب دیکھئے ان دونوں صورتوں میں کس قدر فرق ہے۔ عوام اہل مزار سے اکثر پہلی صورت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ان کے افعال اعمال سے یہ ظاہر ہے پھر شرک نہیں تو اور کیا ہے۔ برخلاف محض وسیلہ سمجھنے کے۔ پس شرع شریف میں عبادت غیر اللہ جہاں صادق آئے گا گو بہ نیت توسل ہی سہی وہ مشرک ہوگا۔ غرض توسل تو

[1] ہم انکی پوجا نہیں کرتے مگر صرف اس لیے کہ وہ ہمیں اللہ سے قریب کر دیں گے

جائز مگر تعبد توسل شرک۔ (مقالات حکمت نمبر ۵، دعوات عبدیت لحصہ اول)

قبروں سے مدد چاہنا

(ب) لوگ قبروں پر جا کر ان سے دنیا کے کاموں میں مدد اور اعانت چاہتے ہیں اور قبروں پر جانے میں بالکل یہی اعتقاد ہوتا ہے کہ وہ ہمارے مدد معاون ہو جائیں گے۔ سو یہ اور بھی بے ادبی ہے اس لئے کہ وہ حضرات مقرب ہیں جب دنیا میں زندہ رہ کر دنیوی تذکروں اور جھگڑوں کو پسند نہیں فرماتے تھے تو اب عالم آخرت میں جا کر کیسے پسند کریں گے جبکہ امور آخرت میں مستغرق بھی ہوں اور ایسی حالت میں ان سے دنیوی قصوں میں مدد چاہنا دین کے خلاف تو ہے ہی تو وہ عقل کے بھی خلاف ہے کیونکہ جب دنیا ان کے پاس نہیں رہی تو ان سے دنیا مانگنا یا دنیوی کاموں میں مدد، یا اعانت کی خواہش کرنا، کیسے تسلیم کر سکتی ہے۔ ہاں ان سے وہ چیزیں مانگو جو ان کے پاس ہوں تو اب بھی صاحب نسبت ان سے فیض حاصل کر سکتا ہے اور روپیہ اور بیٹا تو ان کے پاس ہے بھی نہیں۔ پس وہ تم لوگوں کو کیسے دیں گے۔ کوئی قبر کھول کر دیکھے تو وہاں ایک روپیہ بھی نہ ہوگا تو پھر ایسی چیزیں ان سے مانگنا جو ان کے پاس بھی نہیں کیسی بے عقلی کی بات ہے رہا یہ خیال کہ وہ دعا کر دیں گے تو ایسا کون خیال کرتا ہے کوئی بڑا ہی خوش عقیدہ ہوگا کہ اس خیال سے قبروں پر جاتا ہوگا، ورنہ عام عقیدہ تو یہی ہے کہ وہ خود دیتے ہیں۔

ایک حکایت

چنانچہ کانپور میں ایک بڑھیا ایک شخص کے پاس آئی کہ بڑے پیر صاحب کی نیاز دیدو۔ انہوں نے کہا کہ بڑی نیاز تو اللہ میاں کی دیئے دیتا ہوں اور ثواب بڑے پیر کو پہونچائے دیتا ہوں، اس نے جواب دیا کہ نہیں اللہ میاں کی نیاز تو میں دلا چکی ہوں۔ اس پر بڑے پیر ہی کی نیاز دیدو۔ اس سے صاف ظاہر ہوا کہ عوام بزرگوں کو صاحب اختیار بالاستقلال سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایکمرتبہ جامع مسجد میں ایک بڑھیا آئی اور کہنے لگی کہ ایک پرزہ تعزیہ پر لٹکانے کو لکھدو ہم نے کہدیا کہ یہاں کسی کو ایسا پرزہ لکھنا نہیں آتا۔ ایک اور قصہ مجھے یاد آیا۔ ایک صاحب یہاں تک بیان کرتے تھے کہ میں نے تعزیہ میں ایک پتلا موم کا رکھا دیکھا۔ قصہ یہ ہے کہ ایک شخص نے ایک عرضی لٹکائی اور اولاد کی درخواست کی ایک شخص نے اس عرضی کے نیچے یہ جواب لکھدیا کہ تمہاری بیوی بانجھ ہے اسے طلاق دیکر دوسری شادی کر لو اور یہ شعر لکھدیا ؎

[1] وسیلہ کی خاطر عبادت کرنا [2] ڈوبے ہوئے۔

زمینِ شور سنبل بر نیاید ‏ ‏ ‏ ‏ در و تخم عمل ضائع مگرداں

اور اس کے نیچے لکھدیا۔ راقم امام حسین۔ عرضی والے نے جو اس جواب کو دیکھا تو بہت بگڑے کہ یہ کس نے میرے ساتھ مذاق کیا۔ کسی نے کہا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ یہ اور کسی نے لکھدیا ہے ممکن ہے کہ یہ انھوں نے ہی لکھا ہو۔ کیونکہ اگر وہ اس کے پڑھنے پر قادر ہیں تو لکھنے پر بھی قادر ہوں گے۔ لہذا ممکن ہے کہ خود حضرت امام ہی لکھ گئے ہوں ۔

خلاف ادب کام

سو آج کل لوگوں کی یہ حالت ہے اور یہ شریعت اور ادب اور عقل سب کے خلاف ہو رہا ہے۔ غرضیکہ جب زندوں سے اس قسم کی باتیں کرنا خلاف ادب ہیں تو مردوں سے تو اور بھی زیادہ خلاف ادب ہونگی ان حضرات کو ایسی باتوں سے ایسی ہی نفرت ہوتی ہے جیسے کسی مہذب مجلس میں گوموت کے ذکر سے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ ان حضرات کو تو دنیا کے تذکرہ سے بھی نفرت ہوتی ہے۔ حضرت رابعہ کے یہاں چند بزرگوں نے دنیا کی مذمت کی تو انھوں نے فرمایا کہ تم میرے پاس سے کھڑے ہو جاؤ۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو دنیا کی محبت ہے۔ من احبّ شیئًا اکثر ذکرہٗ ۔ (اتباع المنیب ص۹)

۱۴۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت پر جلوس نکالنا

آج کل ہمارے چند اخوان[1] زمان نے ایک عظیم الشان مفسدہ کی بنیاد ہندوستان میں ڈالی ہے یعنی یوم ولادت جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یوم عید بنانے کی تجویز کی ہے اور یہ خیال ان کے ذہن میں دوسری اقوام کے طرز عمل کو دیکھ کر پیدا ہوا ہے لیکن اس قاعدہ مذکورہ کی بنا پر لوگوں کو سمجھ لینا چاہئے کہ یوم ولادت کی خوشی دنیوی خوشی نہیں ہے۔ یہ مذہبی خوشی ہے پس اس کے تعیین طرق کے لئے وحی کی اجازت ضروری ہے اور اگر کوئی یہ کہے کہ ہم بطور سالگرہ کے دنیوی طرز پر کرتے ہیں تو میں کہوں گا کہ ایسا کرنیوالے سخت بے ادبی اور گستاخی جناب نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں کر رہے ہیں۔ صاحبو! کیا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جلالت و عظمت پر دنیا اور دنیا

[1] زمانہ کے بھائیوں نے

کے بادشاہوں پر جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ بھی نسبت نہیں ہے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس فرحت کے لئے بس ایک دنیوی رذیل سامان اسی طرح کا کرتے ہو۔ جیسا ان سلاطین کے لئے کیا کرتے ہو۔ ع۔

"چہ نسبت خاک را با عالم پاک"

ایک بزرگ کی حکایت

مجھے اس موقعہ پر ایک بزرگ کی حکایت یاد آگئی کہ وہ جنگل میں رہتے تھے ایک کتیا پال رکھی تھی اتفاق سے ایکمرتبہ کتیا نے بچے دیئے تو آپ نے تمام شہر کے معززین کو مدعو کیا لیکن ایک بزرگ شہر میں رہتے تھے ان کو نہیں بلایا۔ ان بزرگ نے از راہ بے تکلفی دوستانہ شکایت کی تو ان بزرگ نے جواب میں کہلا کر بھیجا کہ حضرت میرے یہاں کتیا نے بچے دیئے تھے اس کی خوشی میں سگانِ دنیا کی دعوت کردی۔ سخت گستاخی تھی کہ میں ان دنیا کے کتوں کے ساتھ آپ کو مدعو کرتا۔ جس روز میرے اولاد ہوگی اور مجھ کو خوشی ہوگی اس دن آپ کو مدعو کروں گا۔ اور کتوں میں سے ایک کو بھی نہ پوچھونگا۔

دنیاداروں کا سا معاملہ نبی کے ساتھ

جب اولیاء کے ساتھ دنیاداروں کا سا برتاؤ بے ادبی ہے تو سید الانبیاء کے ساتھ دنیاداروں کا سا برتاؤ کیسے بے ادبی نہ ہوگی۔ اب اس کی دلیل سنیئے کہ یوم ولادت مذہبی خوشی ہے دنیوی خوشی نہیں ہے۔ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ دنیا کا اطلاق اس خطۂ زمین پر یا زیادہ سے زیادہ چند فرسخ اس کے متصل ہوا پر ہوتا ہے پس اگر کوئی دنیوی خوشی ہوگی تو اس کا اثر اس خطۂ زمین تک محدود رہیگا اس سے متجاوز نہ ہوگا اور ولادت حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کے دن نہ صرف زمین کے موجودات بلکہ ملائکہ عرش و کرسی اور باشندگانِ عالم سب کے سب مسرور اور شاداں تھے، وجہ یہ تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریف کفر و ضلالت کی ماحی اور توحید حق کی حامی تھی۔ جس کی بدولت عالم کا قیام ہے کیونکہ قیامت اسی وقت قائم ہوگی جب ایک شخص بھی دنیا میں خدا کا نام لینے والا نہ رہے گا اور قیامت کے قائم ہونے سے فرشتے بھی کثر فنا ہو جائیں گے، پس آپ کا ظہور چونکہ سبب تھا تمام عالم کے بقاء کا اس لئے تمام عالم میں یہ خوشی ہوئی۔ جب اس کا اثر دنیا سے متجاوز ہوگیا۔ تو اس خوشی کو دنیاوی خوشی نہیں کہہ سکتے۔ جب معلوم ہوا کہ یہ دنیوی خوشی نہیں بلکہ مذہبی خوشی ہے تو اسمیں ضرور ہر طرح سے وحی کی احتیاج ہوگی۔ یعنی اس کے وجود میں بھی اور اس کی کیفیت میں بھی ۔

یوم ولادت پر خوشی منانے کی کوئی دلیل نہیں

اب مجوزین ہم کو دکھلائیں کہ کس وحی سے یوم ولادت کے یوم عید بنانے کا حکم معلوم ہوتا ہے اور کیا صورت اس کی بتلائی گئی ہے اگر کوئی قل بفضل اللہ سے استدلال کرے تو میں کہوں گا کہ صحابۂ کرام جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اٹھائے ہوئے تھے اور تمام عالم سے زیادہ کلام مجید کو سمجھتے تھے ان کی سمجھ میں یہ مسئلہ کیوں نہیں . . آیا۔ بالخصوص جب کہ حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت بھی ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کی ہوئی تھی۔ علیٰ ہذا تابعین رحمہم اللہ جنمیں بڑے بڑے مجتہدین ہوئے ہیں ان کی نظر یہاں تک کیوں نہیں پہنچی۔ ہاں جن امور کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت ہے اس کو ضرور کرنا چاہیئے۔ مثلاً آپؐ نے اپنی ولادت کے دن روزہ رکھا اور فرمایا۔ ذالك اليوم الذی ولدت فيه اس لئے ہم کو بھی اس دن روزاہ رکھنا مستحب ہو سکتا ہے۔ دوسرے پیر کے دن نامہ اعمال حق تعالیٰ کے روبرو پیش ہوتے ہیں پس یہ مجموعہ وجہ ہوگی اس حکم کی۔ اگر منفرداً بھی مانا جاوے تب بھی صحیح ہے لیکن صرف اسی قدر کی اجازت ہوگی جتنا کہ ثابت ہے (اکمل الصوم والعید صـ۲۴)

۱۵۔ عرس کے حقیقی معنی اور بزرگوں کے مروّجہ عرسوں کا خلاف شرع ہونا

آج کل جو لوگوں نے بزرگوں کے عُرس کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ یہ بھی محض لغو اور تجاوز عن الحد ہے۔ اصل حقیقت اس کی یہ تھی کہ عُرس . . . . . . کے معنی لغت میں شادی کے ہیں۔ اور حاصل شادی کا یہ ہے کہ محب کا محبوب سے وصل ہو۔ پس چونکہ ان حضرات کی موت ان کے لئے وصل محبوب ہے۔ اس لئے ان کے یوم وصال کو یوم العرس کہا جاتا ہے۔ نیز ایک روایت میں بھی آیا ہے کہ جب کسی مقبول بندہ کی وفات ہوتی ہے اور فرشتے . . . . ان کی قبر میں آکر سوال کرتے ہیں۔ تو سوال وجواب کے بعد کہتے ہیں۔ نمۃ کنومۃ العروس تو وہ دن ان حضرات کے لئے یوم العرس ہوا۔ اسی کو ایک بزرگ خوب کہتے ہیں ؎

ؔ دلہن کی طرح بے فکر سو جا

؎ خوشا روزے وخرم روزگارے | کہ یارے برخورد از وصل یارے

اور گو وصل ان حضرات کو دنیا میں بھی ہوتا ہے تاہم اس وصل میں اور اس وصل میں فرق ہے کہ یہاں پر حجاب ہے اور وہاں بلا حجاب۔ جیسا مولانا نے فرمایا ؎۔

گفت مکشوف و برہنہ گو کہ من | مے نہ گنجم با صنم در پیرہن

اگرچہ خدا تعالیٰ جسم اور لوازم اور عوارض جسم سے پاک ہے لیکن یہ مثال کے لئے . . . کہا جاتا ہے اور جیسا حضرت غوث فرماتے ہیں ؎

بے حجابانہ درآ از در کاشانہ ما | کہ کسے نیست بجز درد تو درخانۂ ما

یہ کیفیت تو وہاں کے وصال کی ہے اور دنیا میں بوجہ حجاب اور سیری نہ ہونے کے ان کی یہ حالت ہوتی ہے ؎

دل آرام در بر دل آرام جو | لب از تشنگی خشک بر طرف جو

نگویم کہ بر آب قادر نیند | کہ بر ساحل نیل مستسقی اند

اور چونکہ ان کو مرکز یہ دولت نصیب ہوتی ہے اس لئے وہ تمنائیں کرتے ہیں اور شدتِ شوق میں یوں کہتے ہیں کہ ؎

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بردم | راحتِ جاں طلبم وز پئے جاناں بروم

اور ان حضرات کو چونکہ مرنے کی خوشی ہوتی ہے اس لئے اس میں نہایت مطمئن ہوتے ہیں۔

مرنے پر خوشی

چنانچہ ایک نقشبندی بزرگ کی حکایت ہے کہ انہوں نے وصیت کی تھی جب میرا جنازہ لے چلو تو ایک شخص ساتھ ساتھ یہ اشعار پڑھتا چلے ؎

مفلسانیم آمدہ در کوئے تو | شیئاً للہ از جمالِ روئے تو

دست بکشا جانب زنبیل ما | آفریں بر دست و بر بازوئے تو

کیوں صاحب کیا بے اطمینانی میں کسی کو ایسی فرمائشوں کی سوجھ سکتی ہے۔ یہ غایت فرحت کا اثر تھا۔ حضرت سلطان نظام الدین اولیاء قدس سرہٗ کی حکایت مشہور ہے کہ جب آپ کا انتقال ہو گیا اور جنازہ لے چلے ایک مرید نے شدت غم میں درد کے ساتھ یہ اشعار پڑھے ؎

سرو سیمینا بصحرا می روی | سخت بے مہری کہ بے ما میروی

اے تماشا گاہِ عالم روئے تو | تو کجا بہر تماشا می روی ۔

لکھاہے کہ ہاتھ کفن کے اندر بلند ہوگیا۔ صاحبو ایک ایسا شخص جس کی یہ حالت ہو کہ ع

ع پا بدستی دگرے دست بدست دگرے

کیا اس کو وجد ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی بے حد فرحت کا دن ہوتا ہے ایک دوسرے بزرگ انتقال کے وقت منتظرانہ و مشتاقانہ فرماتے ہیں ؎

وقت آں آمد کہ من عریاں شوم — جسم بگذارم سراسر جاں شوم

اور یہ حالت کیوں نہ ہو جب کہ وہ جانتے ہیں کہ اب پردہائے ہیولانی جو کہ مانع دیدار کھے اٹھتے ہیں اور کوئی گھڑی ہے کہ محبوب حقیقی کا دیدار نصیب ہوگا صرف یہ نہیں کہ ان کو جنت یا حوروں کی ہوس ہوتی ہے۔

ابن الفارض کا واقعہ

حضرت ابن الفارض کا واقعہ لکھاہے کہ ان کا انتقال ہونے لگا تو جنت منکشف ہوئی آپ نے اس طرف سے منہ پھیر لیا اور کہا ؎

ان کان منزلتی فی الحب عندکم — ما قد رأیت فقد ضیعت ایامی

کہ جان تو آپ کے لئے دے رہا ہوں جنت کو کیا کروں آخر جنت چھپ گئی اور روزاً تجلی ظاہر ہوئی اور جان بحق ہوئے ان کی بالکل وہی حالت ہو گئی کہ۔

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد — تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم

اکثر لوگ ان حالات کو سن کر تعجب کریں گے لیکن یہ تعجب صرف اس وجہ سے ہے کہ خود اس سے محروم ہیں۔ مگر ایسے لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ ع

"تو مشو منکر کہ حق بس قادر است"

بزرگوں کی موت یوم مسرت ہے

غرض بزرگوں کے حالات اور حدیث وغیرہ سے بھی یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان بزرگوں کی وفات کا دن یوم العرس ہے لیکن لوگوں نے اس کے مفہوم و مصداق دونوں کو بالکل خراب کر دیا ہے مصداق کی خرابیاں تو ظاہر ہیں کہ تمام شرک و بدعت اس عرس کا جزو ہو گئی ہیں۔ باقی مفہوم کی خرابی یہ کہ اس لفظ کے لغوی معنی لے کر شادی کے لوازم بھی وہاں جمع کر دیئے چنانچہ اکثر جگہ رسم ہے کہ بزرگوں کی قبر پر مہندی چڑھاتے ہیں۔ نوبت نقارہ رکھتے ہیں اسی طرح مزامیر وغیرہ سب لغو حرکتیں جمع کر رکھی ہیں غریب مردہ پر تو بس چلتا نہیں قبر کی گت بنائی جاتی ہے تو حقیقت میں وہ یوم العرس اس اعتبار سے ہے کہ جس کو ذکر کیا گیا کہ وہ ان بزرگوں کی خوشی

کا دن ہے۔ اور یہ کوئی دنیوی خوشی نہیں ہے تو اس میں کوئی طریقہ مقرر کرنے کے لئے ضرورت وحی کی ہوگی اور وحی ہے نہیں بلکہ اس کے خلاف پر وحی ہے چنانچہ ظاہر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ لا تتخذوا قبری عیدا کہ میری قبر کو عید نہ بنانا۔ عید میں تین چیزیں ضروری ہیں ایک اجتماع دوسرے تعیینِ وقت۔ تیسرے فرحت۔ تو ممانعت کا خلاصہ یہ ہوا کہ میری قبر پر کسی یوم معین میں سامان فرحت کے ساتھ اجتماع نہ کرنا ہاں اگر خود بخود کسی وقت بین کسی غرض سے اجتماع ہو جاوئے تو اور بات ہے۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہاں سے تشریف لے جانا اگرچہ آپ کے لئے باعثِ سرور ہے لیکن ہمارے لئے تو باعث حزن ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے جو ہم پر نعمت کامل فرمائی ہے جس کو میں نے نشر الطیب میں لکھا ہے وہ دوسرے اعتبار سے ہے پس جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر ایسا اجتماع جائز نہیں تو دوسروں کی قبر پر ایسا اجتماع کیونکر جائز ہوگا اور عجیب برکت ہے کہ آج تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر اجتماع کا کوئی خاص دن معین نہیں ہوا۔ (ایضاً ص ۳۶)

۱۶- شادی اور غمی کی رسوم خلاف شرع اور واجب الترک ہیں

(۱) شادی اور غمی کی رسمیں ہیں کیا آج کوئی مسلمان یہ کہہ سکتا ہے کہ یہ رسمیں شریعت کے خلاف نہیں ہیں اور اگر واقعی کسی کو معلوم نہیں تو اس کو چاہیئے کہ اس قسم کی کتابیں مطالعہ کرے، جو اس کے بیان کرنے کے لئے تصنیف کی گئی ہیں یا جو لوگ اس مجمع میں موجود ہیں وہ اسی وقت کچھ سُن لیں۔ سنیئے۔ شادی غمی کی رسمیں دو قسم کی ہیں ایک تو وہ ہیں کہ جن کا قبیح ہونا نہایت ہی ظاہر ہے اور شرفاء و ثقافت نے ان کو بالکل ہی چھوڑ دیا ہے اب صرف اسافل اور فساق الناس اسمیں مبتلا ہیں۔ مثلاً ناچ رنگ وغیرہ۔ اور بعض وہ رسمیں ہیں کہ ان کا قبح اتنا ظاہر نہیں۔ ان میں عوام وخواص قریب قریب سبھی مبتلا ہیں اور ان کو بالکل جائز سمجھا جاتا ہے بلکہ بسا اوقات ادعائے تقویٰ کے طور پر کہا جاتا ہے کہ ہم نے شادی میں کونسی رسم کی ہے نہ ہمارے ہاں ناچ ہوا اور نہ باجا منگایا گیا۔ پھر ہم نے کیا گناہ کیا۔ سو میں بتلاتا ہوں کہ آپ نے کیا گناہ

کیا ہے لیکن پہلے مجھے یہ تبلا دیجئے کہ گناہ کہتے کس کو ہیں۔ ظاہر ہے جو امر شرعاً ممنوع ہو۔ وہ گناہ کہلاتا ہے خواہ وہ ناچ ہو یا کوئی دوسرا امر ہو کیونکہ ناچ بھی تو اسی واسطے حرام ہوا کہ شریعت نے اس کو حرام اور جرم قرار دیدیا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ناچ کے علاوہ دوسری رسوم کو بھی شریعت نے جرم قرار دیا ہے یا نہیں۔ اس پر مفصل گفتگو تو اصلاح الرسوم میں ملے گی۔ میں مختصراً اس وقت بقدر ضرورت بیان کئے دیتا ہوں۔

تکبر کی حمایت

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ خدائے تعالیٰ نے قرآن شریف میں نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث شریف میں تکبر کی سخت ممانعت فرمائی ہے چنانچہ ارشاد ہے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ط حدیث شریف میں ہے لا یدخل الجنۃ من کان فی قلبہ مثقال حبۃ من خردل من کبر۔ دوسری حدیث میں ہے من لبس ثوباً شھرۃ البسہ اللہ ثوب الذل یوم القیامۃ آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ بیشک اللہ تعالیٰ کسی اکڑنیوالے اور فخر کرنے والے کو دوست نہیں رکھتے، اور حدیث اول کا ترجمہ یہ ہے جس کے قلب میں رائی برابر بھی تکبر ہوگا وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر شہرت کے لئے کپڑا پہنے گا تو قیامت میں اللہ تعالیٰ اس کو ذلت کا لباس پہنائیں گے۔ اس آیت اور حدیث سے معلوم ہوا کہ فخر کے لئے کوئی کام کرنا حرام ہے۔ ایک حدیث شریف میں ارشاد ہے من سمع سمع اللہ بہ ومن رأی اللہ بہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دکھلاوے اور شہرت کا کام کرنا حرام ہے۔

شادی میں انسان کا حال

اب غور کرکے دیکھئے کہ شادیوں میں جو کام ہم کرتے ہیں اور جن کے لئے ہم نے نہایت خوبصورت الفاظ تراش رکھے ہیں کہ بھات دیا ہے اور بھائیوں کو کھلایا ہے اور بیٹی کو دیا ہے وغیرہ وغیرہ ان میں نیت ہماری کیا ہوتی ہے۔ صاحبو! محض الفاظ کے خوبصورت ہونے سے کسی چیز کی حقیقت نہیں بدل جاتی۔ سب سے بڑی چیز نیت ہے لہذا نیت کو دیکھنا چاہیئے کیا ہم لوگ یہ تمام رسمیں محض رسم اور نمود کے لئے نہیں کرتے۔ بہنوں کو بڑا بھات دیا جاتا ہے اور اس کو صلہ رحمی کہا جاتا ہے کیوں صاحب آج سے آٹھ دن پہلے بھی تو یہ بہن آپ ہی کی بہن تھی۔ پھر کیا آپ نے اسکی خبر لی ہے کبھی بہن کے فقر و فاقہ پر آپ کو رحم آیا ہے نیز اگر یہ صلہ رحمی ہے تو تمام برادری کو اس کا معائنہ کرانے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا کبھی اپنی لڑکی کے لئے یا کپڑا خریدتے وقت یا اس کو کھلاتے پلاتے وقت بھی آپ نے

برادری کو جمع کیا ہے اگر نہیں کیا تو بھات اور جہیز دیتے وقت برادری کو کیوں جمع کیا جاتا ہے، معلوم ہوا کہ محض فخر اور نام و نمود کے لئے ایسا کیا جاتا ہے بس یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ یہ سب رسوم محض شہرت کے لئے ہیں اور شہرت کے لئے جو کام کیا جاتا ہے وہ بروئے حدیث شریف حرام ہوتا ہے، تو سب رسوم بھی حرام ہوئیں۔

نیوتہ کی رسم

بالخصوص ایک رسم تو ایسی گندی ہے کہ وہ توبہ سے بھی معاف ہونا مشکل ہے کیونکہ اس کی توبہ بھی مشکل ہے اور لطف یہ ہے کہ اس کو بظاہر عبادت سمجھا جاتا ہے اور اس پر فخر کیا جاتا ہے اور وہ رسم نیوتہ لینا دینا ہے لوگ اس کو قرض حسنہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بھائی بھائی کی مدد کرتا ہے اور مدد کرنا عبادت ہے تو گویا نیوتہ دینا عبادت ہوا۔ حالانکہ نیوتہ دینا اس قدر بری رسم ہے کہ سب رسموں میں گندی ہے اس کو شاید آپ نے آج تک نہ سنا ہوگا۔ مگر میں اس وقت انشاء اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت بیان کردوں گا اور وہ کوئی عجیب اور نئی بات نہ ہوگی، بلکہ پرانی بات ہے لیکن آپ نے عدم توجہ کے سبب اس میں غلطی کر رکھی ہے۔ مقدمات سب آپ کے مسلّم ہیں صرف نتیجے میں آکر غلطی ہو رہی ہے جیسے کسی شخص نے تبت کے ہجے کئے تھے ت ب زبر تب ت زبر بت اور رواں پڑھا تھا۔ بطخ۔ تو آپ نے بھی ہجے تو صحیح کئے ہیں مگر رواں میں غلطی کر رکھی ہے جس کو میں تبلاتا ہوں۔ وہ یہ کہ یہ امر سب کو مسلم ہے اور کوئی شخص اس سے منکر نہیں کہ نیوتہ قرض ہے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض واجب الادا رہوتا ہے۔ تیسرا مسئلہ یہ ہے کہ قرض خواہ کی موت کے بعد اس کا کل ترکہ اس کے ورثاء کی ملک ہوتا ہے خواہ وہ ترکہ عین ہو یا کسی کے ذمہ دین ہو مثلاً اگر کوئی شخص مرے اور سو روپے اس کے گھر میں موجود ہوں اور سو روپے ادھار میں تو اس کا کل ترکہ دو سو روپے سمجھا جائے گا۔ اور یہ دو سو روپے ملا کر سب ورثاء کو تقسیم کئے جائیں گے۔ ان تینوں مسئلوں کے معلوم ہونے کے بعد دیکھئے۔ نیوتہ میں کیا ہوتا ہے۔ سو نیوتہ میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص نے پچیس جگہ دو دو روپے دیئے۔ اور اس طرح پچاس روپئے اس کے قرضے میں پھیل گئے اور اس کے بعد یہ شخص مرا۔ اور دو بیٹے اس نے وارث چھوڑے جن میں ایک بالغ اور دوسرا نابالغ، تو موجودہ ترکہ میں سے تو ان دونوں نے نصفا نصف لے لیا وہ بھی جب بڑا بھائی بڑا ایماندار ہو۔

نیوتہ کی خرابیاں

لیکن جو نیوتے میں قرض ہے اس کو کوئی بھی تو تقسیم نہیں کرتا۔ چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ اگر چند روز کے بعد اس بالغ لڑکے کی کسی اولاد کی شادی ہونے لگی تو لوگ وہ نیوتہ اسی کو لاکر دیں گے اور یہ بلا تامل سارا نیوتہ خود ہی خرچ کرے گا اور اپنے کو ہی اس کا مالک

سمجھے گا۔ حالانکہ ان پچاس روپیوں میں سے پچیس روپے اس کا حق ہے اور پچیس اس کے چھوٹے نابالغ بھائی کا حصہ ہے۔ اسی طرح علی العموم تمام نیوتوں میں ہی کیا جاتا ہے۔ کیا کوئی شخص بتلا سکتا ہے کہ کسی نیوتہ کو فرائض کی رو سے تقسیم کیا گیا ہو میرے خیال میں ایک جزئی بھی اس کی نہیں بتلائی جا سکتی تو اس میں ایک گناہ تو اسی . . . . . بالغ بھائی کا ہوا کہ اس نے یتیم کا مال کھایا قرآن شریف میں ہے۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَاۡکُلُوۡنَ اَمۡوَالَ الۡیَتٰمٰی ظُلۡمًا اِنَّمَا یَاۡکُلُوۡنَ فِیۡ بُطُوۡنِہِمۡ نَارًا ؕ وَ سَیَصۡلَوۡنَ سَعِیۡرًا [1] ؕ اور ایک گناہ نیوتہ واپس کرنے والوں پر ہوا کہ انھوں نے مشترک مال ایک شریک کو دیدیا اور لطف یہ ہے کہ نیوتہ دینے والے سمجھتے ہیں کہ ہم قرض سے سبکدوش ہو گئے حالانکہ ابھی پچیس روپے یتیم کے ان کے ذمے باقی ہیں اور درمختار میں روایت لکھی ہے کہ اگر کسی کے ذمے کسی کے تین پیسے رہ جائیں گے تو قیامت میں سات سو نمازیں قرض خواہ کو دلائی جائیں گی اور یہ اس وقت ہے کہ جب مالک کے بیٹے ہی کو وصول ہو گیا ہو۔ اور اگر دو تین پشتیں گذر گئیں اور مناسخہ جاری ہو گیا تو پھر تو خدا جانے دور دور تک کس کس کا حق اس میں متعلق ہو گیا جس کا پہچاننا سخت ہی دشوار ہے۔ اگر کوئی . . . . . کہے کہ یہ تو باپ دادا کے وقت سے چلا آتا ہے تو میں کہوں گا یہ عذر ہرگز قابل سماعت نہیں کیونکہ اگر اسی پر عمل کیا جاتا تو آج ہم لوگ مسلمان نہ ہوتے آخر ہم کو اسلام تو اسی لئے نصیب ہوا کہ ہمارے باپ دادا نے اپنے آباؤ اجداد کے رسم و رواج کو ترک کر دیا۔ لہٰذا یہ عذر نہایت کمزور ہے اس کا علاج اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پچھلے قرض کو تحقیق کر کے ادا کیا جائے اور آئندہ کو یہ رسم بالکل چھوڑ دی جائے۔ یا کوئی عربی خواں یا انگریزی خواں اس کے سوا کوئی دوسرا علاج مجھے بتلا دیں غرض نیوتہ کی رسم نہایت گندی اور خراب ہے اگرچہ بظاہر یہ ثواب کا کام نظر آتا ہے۔ اور جب یہ اس قدر خراب رسم ہے جس میں ایک گونہ اعانت غریب کی مصلحت بھی ہے تو دوسری رسوم تو جسمیں کوئی بھی مصلحت نہیں بالکل ہی قابل ترک ہوں گی۔

دوسری رسمیں

اسی طرح ہم نے ہر قدم پر ایک ایک رسم ایجاد کی ہے کہ جب تک وہ نہ ہو گویا شادی ہی نہ نہیں ہو سکتی اور ان رسوم میں جو دنیا کی مضرتیں ہیں ان کا بیان کرنا گو میرا منصب نہیں ہے لیکن ایک مختصر سے جملے میں ایک گونہ رعایت بھی غریب کی مصلحت بھی ہے۔ تبرعًا ان کو بھی بیان کئے دیتا ہوں وہ یہ کہ مسلمانوں پر جس قدر تباہی آئی ہے زیادہ تر

---

[1] بلاشک جو یتیموں کا مال کھاتے ہیں ظلم کر کے وہ اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ کھاتے ہیں۔

انہیں رسموں کی بدولت آتی ہے کیونکہ آمدنی ہر مسلمان جتنی ہے سب پر ظاہر ہے اور خرچ ان رسمونکی بدولت جیسا کچھ ہوتا ہے وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ مآل اس مجموعہ اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ آج زمین رہن ہو رہی ہے کل مکان پر قرقی ہے پرسوں زیور اور اثاث البیت نیلام ہو رہا ہے چوتھا دن نہیں آیا کہ میاں پابند رسوم بیک بینی و دوگوش رہ گئے۔ بعض لوگ اس کا یہ جواب دیا کرتے ہیں کہ ہم میں گنجائش ہے اور ہم کو قرض لینا نہیں پڑتا۔ سو اول یہ جواب تو مسلم نہیں۔ کیونکہ ہر حیثیت کا آدمی اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرنا چاہتا ہے اور اس میں قرض لینا لازمی ہے۔ دوسرے اگر مان بھی لیا جائے کہ ان کو قرض نہ لینا پڑے گا۔ تو کم از کم ان کو اپنے غریب بھائیوں کا تو خیال ضرور ہی کرنا چاہئیے اور سمجھنا چاہئیے کہ ہم کریں گے تو حرص کے مارے وہ بھی کریں گے اور تباہ ہوں گے تو اس لئے ہم بھی نہ کریں۔ تیسرے جب یہ گناہ ہے اس لئے بھی اس کو چھوڑ دینا چاہئیے گو دنیوی مضرت بھی نہ ہو۔

غموں کی رسمیں

اسی طرح غمی کی رسمیں ہیں کہ ان میں بھی جو کچھ کیا جاتا ہے وہ محض شہرت کے لئے کیا جاتا ہے نہ کہ خدا کے لئے کیونکہ اگر خدا کے لئے کیا جاتا تو پوشیدہ طور پر کرنا بھی گوارا کیا جاتا اس دکھلانے اور سب پر ظاہر کرنے کا اہتمام کیوں ہوتا۔ معلوم ہوا کہ محض شہرت ہی مقصود ہے اور امتحان اس کا یہ ہے کہ اگر کسی پابند رسوم سے یہ کہا جائے کہ بجائے اس ڈھونگ کے تم پچاس روپے دس مساکین کو دیدو اور کسی کو خبر نہ کرو تو وہ ہرگز راضی نہ ہوگا بلکہ یوں سمجھے گا کہ اس طرح کرنے سے یہ پچاس روپے ضائع ہی ہو جائیں گے اور کہے گا اچھا مولوی صاحب نے رائے دی کہ پچاس روپئے بھی کروں اور کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ صاحبو! یہ تو آپ لوگوں کی حالتیں ہیں اور پھر کہا جاتا ہے کہ مولوی ثواب بخشنے سے روکتے ہیں یہ تو بتلاؤ کہ خود آپ کو ہی کب ثواب ہوا تھا کہ دوسرے کو بخشنے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مولوی تو آپ کو ثواب ملنے اور ثواب بخشنے کی ترکیب بتلاتے ہیں۔ ثواب سے منع نہیں کرتے اور وہ ثواب بخشنے کی ترکیب یہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو اور بائیں کو . . . . . خبر نہ ہو نیز اپنے خاص حصے سے دو مردے کے وہ کپڑے جن میں وہ تمام ورثا نابالغ و بالغ کا حق متعلق ہو گیا ہے وہ نہ دیدو۔ اگر دو تو ان کو تقسیم کر لو۔ اور جو تمہارے حصہ میں آئیں وہ دو۔ مشترک ہرگز نہ دو۔ ثواب کا طریقہ یہ ہے نہ وہ جو آپ نے تراش رکھا ہے لوگ چاہتے ہیں کہ نام بھی ہو اور ثواب بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ سو ریا میں ثواب کہاں اور الٹا عذاب ہے۔ شیخ علیہ الرحمۃ اس کی بابت فرماتے ہیں ؎

کلید در دوزخ است آں نماز   کہ در چشم مردم گذاری دراز

نمونہ کے طور پر میں نے بیان کر دیا ہے دوسری رسموں کو بھی اسی پر قیاس کر لینا چاہیئے۔

دلائل عقلیہ

یہ تو دلائل نقلیہ تھے۔ عقلی بھی سنو! رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کی شادی کر کے دکھلا دیا ہے کہ شادی اس طرح کرنی چاہیئے علی ہذا اپنے صاحبزادے ابراہیم رضی اللہ عنہ کی غمی کر کے بتلا دیا کہ غمی یوں ہونی چاہیئے پھر جب اس کے موافق نہ کیا اور ہر امر میں اپنی ٹانگ اڑا لی اور اس کا خلاف گراں ہوا تو سہولت اطاعت کہاں ہوئی۔ پھر محبت مطلوبہ کہاں ہوئی۔ اس محبت کا اثر تو یہ ہے کہ اطاعت میں سہولت پیدا ہو اور جب کہ ہم نے بالکل شریعت کے خلاف کیا کہ وضع وہ اختیار کی جو شریعت کے بالکل خلاف ہے۔ معاشرہ وہ پسند ہوئی جس کو شریعت سے کچھ بھی لگاؤ نہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم کو کامل محبت خدا اور رسول سے ہے (آثار المحبت ص ۱۳)

ایصال ثواب کے غلط طریقے

(ب) وصول ہونے کے لئے ہی زیادہ تر ان لوگوں نے اپنی ہوشیاری سے ایصال ثواب کے ایسے طریقے ایجاد کئے ہیں جن کو سوائے ان کے دوسرا عامی آدمی جان ہی نہیں سکتا کہ اول قل ہو اللہ احد ہو۔ پھر تبارک الذی ہو اور پھر یہ ہو اور پھر وہ ہو بعض سورتوں پر بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اور بعض پر نہیں یہ ایسی بات ہے کہ اس کو مولوی بھی نہیں جانتے تو چونکہ یہ طریقہ وہی لوگ جانتے ہیں اس لئے مجبوراً سب عوام ان کے محتاج ہو کر انھیں کے پاس جاتے ہیں اور اس طرح سے انہیں کو ملتا ہے اور پھر غضب یہ کہ یہ لوگ اس میں اور بھی بڑی بڑی چالاکیاں کرتے ہیں ایک سب انسپکٹر مجھ سے کہتے تھے کہ میں کسی تھانہ میں تھا کہ میرے پاس ایک شخص رپٹ لکھوانے آیا کہ کوئی آدمی میری فاتحہ چرا کر لے گیا میں سخت پریشان ہوا کہ فاتحہ چرانے کے کیا معنی۔ اس شخص سے پوچھا تو اس نے کہا موقع پر چلئے آخر موقع پر جا کر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایک نلکی میں پرچی ایک سال کے لئے فاتحہ پڑھ کر بند کر جاتے ہیں کہ جب ضرورت ہو اس میں سے تھوڑی سی جھاڑ لینا۔ فی نلکی (عہ) ان کی مقرر ہے اتفاق سے کسی شخص کے پاس روپیہ تھا نہیں اور اس کو فاتحہ کی ضرورت ہوئی تو اس نے اس شخص کی نلکی چرا لی۔ اس سے بڑھ کر ایک۔

ایک حکایت

حکایت حضرت مولانا گنگوہیؒ سناتے تھے کہ کسی مسجد میں ایک ملا رہتا تھا سب لوگ اس سے فاتحہ وغیرہ دلاتے تھے۔ اتفاق سے ایک بڑھیا

کھانا لیکر آئی۔ اتفاق سے ملاجی اس وقت مسجد میں موجود نہ تھے ایک مسافر بیٹھا ہوا تھا اس نے سمجھ کر کہ مقصود تو ثواب ہی ہے چلو مسافر ہی کو دیدو۔ اس کو کھانا دیکر چلی گئی مسجد کے دروازے سے نکلی ہی تھی کہ ملاجی مل گئے۔ پوچھا کہ بڑھیا کیسے آئی تھیں۔ اس نے سب واقعہ بیان کر دیا آپ فوراً مسجد میں آئے اور لاٹھی لے کر تمام مسجد کے فرش کو خوب پیٹنا شروع اور شور مچانا شروع کیا۔ اور پیٹتے پیٹتے تھوڑی دیر میں دھم سے مسجد کے فرش پر گر گئے۔ لوگوں نے جو غل شور سنا تو سب آکر جمع ہو گئے پوچھا کہ ملاجی کیا ہوا۔ کہنے لگے بھائیو میں تو مدت سے یہاں رہتا ہوں۔ سب مردوں سے واقف ہوں۔ انہیں کو ثواب بخش دیتا تھا۔ یہ نیا آدمی ہے خدا جانے اس نے کس کو ثواب بخشدیا۔ کہ یہاں کے سب مردے مجھے آکر لپٹ گئے میں نے ان کو بہت کچھ بھگایا۔ لیکن میں تنہا تھا۔ کہاں تک لڑتا۔ آخر تھک کر گر گیا۔ اگر دو چار دفعہ ایسا ہوا تو میں مر ہی جاؤں گا۔ اس لئے اور کہیں جاتا ہوں۔ لوگوں نے کہا ملاجی آپ کہیں نہ جایئے ہم آپ ہی کو ہر چیز دیا کریں گے۔ تو جب بنا ان رسوم کی یہ اغراض ہیں تو جب فاتحہ کی عوض ان کو کچھ نہ ملے گا تو الٹے آنکھ پتہ پر فاتحہ پڑھنا ان کو خود ہی مشکل معلوم ہوگا۔ اور اسی طرح بہت جلد اس کا انسداد ہو جائے گا۔ اور یہ بھی ایک علامت ہے ان رسوم کے زائد علی الدین ہونے کی۔ کیونکہ اصلی چیز منجانب اللہ ہر حالت میں محفوظ رہتی ہے چنانچہ جس زمانے میں طاعون کی کثرت ہوئی تو تیجہ دسواں وغیرہ سب چھوٹ گئے تھے۔ صرف وہی چیزیں باقی رہ گئی تھیں جو شرعاً ضروری تھیں۔ بعض لوگوں سے جو میں نے کہا کہ اب وہ رسوم کیوں نہیں ہوتیں تو کہنے لگے کہ صاحب کس کس کی رسمیں کریں یہاں تو روز تیجہ ہی رہتا ہے میں نے کہا دیکھو اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ امور محض زائد ہیں ورنہ اس کثرت موت میں بھی کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی مردے کو بغیر کفن دیئے اور بلا نماز پڑھائے دفن کر دیا ہو۔ اور تیجہ اور دسواں بہت لوگوں کا نہیں ہوا۔ غرض یہ کہ دین کے کاموں میں بھی عجیب عجیب طریقے ایجاد کئے ہیں جن سے مقصود دین میں کامیابی یعنی رضائے حق بمراحل بعید ہے۔ (احسان التدبیر ص ۱۹)

بارات کا ایجاد

(ج) اصل میں یہ برات وغیرہ ہندوؤں کی ایجاد ہے کہ پہلے زمانے میں امن نہ تھا دلہن کی حفاظت کے لئے ایک جماعت کی ضرورت تھی اور اس وجہ سے فی گھر ایک آدمی لیا جاتا تھا کہ اگر اتفاق سے کوئی بات پیش آوے تو ایک گھر میں ایک ہی بیوہ ہو۔ اور اب تو امن کا زمانہ ہے اب اس جماعت کی کیا ضرورت ہے اور اگر خوف بھی ہو تو اس قدر پہنا کر کیوں لاؤ۔ اور اگر کہیئے گا اس میں بھی مصلحت ہے تو اس کا کیا جواب

دوگے کہ بارات والے جاتے تو ہیں جمع ہو کر اور لوٹتے ہیں متفرق ہو کر اور اکثر دلہن اور کہار اکیلے رہ جاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حفاظت وغیرہ کچھ مقصود نہیں صرف رسم کو پورا کرنا اور نام آوری مدنظر ہوتی ہے اور شامت یہ کہ اکثر عصر کے وقت برات چلتی ہے اور لڑکی کے ماں باپ بھی ایسا غضب کرتے ہیں کہ اسی وقت رخصت کر دیتے ہیں شاید یہ سمجھتے ہیں کہ اب ہماری چیز نہ رہی ورنہ حفاظت کی اب پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کیونکہ زیب و زینت کی حالت میں ہے خدا جانے کیا بات پیش آوے۔

دین چھوڑنے کا انجام

صاحبو! جب انسان دین چھوڑتا ہے تو عقل بھی رخصت ہو جاتی ہے لوگوں کا یہ عام خیال ہے کہ کنواری کی حفاظت کی زیادہ ضرورت ہے بیاہی ہوئی کی نگہبانی کی ضرورت نہیں۔ اور یہ خیال ہندوؤں سے ماخوذ ہے اس کا منشا یہ ہے کہ اگر کنواری سے کوئی بات ہو جائے تو اس میں بدنامی اور رسوائی ہوتی ہے اور بیاہی سے کوئی بات سرزد ہو تو بدنامی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کے تو شوہر ہے اسی کی طرف نسبت کی جائے گی مگر یہ خیال محض جہالت پر مبنی ہے اگر عقل سے کام لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کنواری کی حفاظت کی اتنی ضرورت نہیں جتنی بیاہی ہوئی کے لئے ضرورت ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ کنواری کو قدرتی طور پر بھی شرم و حجاب بہت ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ایک طبعی مانع موجود ہے اس کی زیادہ نگہبانی کی ضرورت نہیں اور بیاہی کا حجاب چونکہ کم ہو جاتا ہے اس کی طبیعت کھل جاتی ہے مانع طبعی اس کے ساتھ نہیں رہتا اس کی عفت و عصمت محفوظ رکھنے کے لئے بہت بڑی نگہبانی کی ضرورت ہے نیز کنواری کو علاوہ مانع طبعی کے خوف فضیحت بھی زیادہ ہوتا ہے اور بیاہی ہوئی کو اتنا خوف نہیں ہوتا۔ کنواری میں تو کوئی آڑ نہیں اور اس میں شوہر کی آڑ ہے اس کا فعل اس کی طرف منسوب ہو سکتا ہے۔ اس لئے بیاہی ہوئی کی طبیعت برے کاموں پر کنواری سے زیادہ مائل ہو سکتی ہے اس کی حفاظت کنواری سے زیادہ ہونی چاہیئے مگر لوگوں نے اس کا الٹا کر رکھا ہے۔

عفت و عصمت کی حفاظت

وجہ یہ ہے کہ اس کی پرواہ آجکل نہیں کی جاتی کہ عصمت و عفت محفوظ رہے صرف اپنی بدنامی اور رسوائی کی پرواہ کی جاتی ہے سو چونکہ کنواری میں بوجہ کوئی آڑ نہ ہونے کے بدنامی کا قوی اندیشہ رہے۔ اس کی نگہبانی تو کی جاتی ہے اور بیاہی ہوئی میں ایک آڑ موجود ہے اس لئے بدنامی کا خوف کم ہے

اس کی حفاظت کم کی جاتی ہے۔ اسی خیال کی بنا پر رخصت کے وقت ماں باپ کچھ خیال نہیں کرتے کہ یہ وقت مناسب ہے یا نہیں جب چاہیں برات کے ساتھ کر دیتے ہیں کیونکہ ان کے نزدیک تو حفاظت کا وقت کنوارپن تک تھا وہ اب ختم ہو چکا ہے چاہے راستے میں ڈاکو ہی مل جائیں بھلا لڑکے والوں کو تو کیا ضرورت پڑی ہے کہ ان باتوں پر خیال کریں مگر لڑکی والوں کو تو سمجھ کر رخصت کرنا چاہیئے۔ یہ خرابیاں ہیں برات میں جن کی وجہ سے برات کو منع کیا جاتا ہے اور میں جو پہلے براتوں میں جایا کرتا تھا جب تک میری سمجھ میں خرابیاں نہ آئی تھیں اب میں ان رسوم کو بالکل حرام سمجھتا ہوں۔ اور اگر تمہاری سمجھ میں نہ آویں تو اصلاح الرسوم دیکھ لو ان ہی رسموں کے روکنے کی وجہ سے ایک گاؤں کا آدمی مجھ سے کہنے لگا کہ یوں سنا ہے کہ تمہارے مسئلے کڑے بہت ہیں۔ میں نے کہا مسئلے تو ایسے ہی ہونے چاہئیں جن میں احتیاط ہو تو حقیقت میں میرے مسئلے کڑے نہیں۔ مگر خدا نے میرے قلم سے بعض باتوں کی خرابیاں ظاہر کرا دیں جو دوسروں نے ظاہر نہیں کیں۔ اس لئے مجھے لوگ سخت مشہور کرنے لگے۔

دلہن کی حفاظت

غرض اگر دلہن کی حفاظت کے لئے برات ہی ہوتی ہے تو متفرق ہو کر کیوں لوٹتے ہیں حتیٰ کہ بعض دفع دلہن اور کہار اکیلے رہ جاتے ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ دولہا تو دلہن کے ساتھ ہوتا ہے تو وہی حضرت کون سے بہادر ہوتے ہیں کیونکہ آجکل رائے یہ ہے کہ شادی جلدی ہونی چاہیئے کیونکہ اب وہ عفت و دیانت طبائع میں نہیں رہی جو پہلے تھی اب زیادہ ضبط کی ہمت نہیں ہوتی۔ غرض آجکل دولہا صاحب کو خود حفاظت کی ضرورت ہے اگر کہیں چور یا ڈاکو چلا آوے تو پہلے دولہا صاحب ڈولے میں گھسیں گے بعض دفعہ دولہا اور دولہن اور دو چار عزیزوں نے ایک گاؤں میں قیام کیا اور برات آگے چلی گئی۔ یہ لوگ حفاظت کے لئے تھے۔ لہذا اب برات کو چھوڑ دینا چاہیئے۔

(دعوات عبدیت حصہ ہشتم وعظ عضل الجاہلیت ص ۵۵)

۱۷- شوہر کے مرنے کے بعد شوہر والوں کا عورت کے نکاح میں اپنا حق سمجھنا غلط ہے

بعض مسلمان قوموں میں یہ آفت ہے کہ شوہر کے مرنے کے بعد عورت میں شوہر والے اپنا حق

سمجھتے ہیں یعنی ماں باپ اس کے مالک نہیں رہتے بلکہ دیور خسر مالک ہوجاتے ہیں بلکہ وہ عورت خود بھی اپنی مالک نہیں رہتی نہ وہ خود کہیں اپنا نکاح کرسکے نہ ماں باپ کرسکیں۔ بلکہ جہاں جیٹھ وغیرہ چاہیں وہاں ہوگا۔ مثلاً خسر تو چاہے کہ اپنے چھوٹے بیٹے سے نکاح کردوں اور باپ چاہے کہ غیر جگہ کرے تو باپ کا کچھ زور نہ چلے گا اور تمنا یہ ہوتی ہے کہ بہو گھر سے باہر نہ جائے چنانچہ ایک عورت نے اپنی بہو کا نکاح ایک بچہ سے کردیا۔ افسوس تو یہ ہے کہ عورتوں کی عقل پر تو پردہ پڑا ہی تھا مردوں کی عقل بھی ماری گئی۔ ان کو بھی اس کا کچھ خیال نہیں ہوتا۔ اور اس کو اپنے نزدیک ہلکی بات سمجھتے ہیں اس لئے میں نے اس وقت یہ آیت پڑھی جس میں ارشاد ہے کہ ایسا دستور کہ عورتوں کو اس طرح سے اپنی ملک میں سمجھیں ناجائز ہے۔ فرماتے ہیں۔ یَا اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا یَحِلُّ لَکُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ کَرْهًا وَلَا تَعْضُلُوْهُنَّ لِتَذْهَبُوْا بِبَعْضِ مَآ اٰتَیْتُمُوْهُنَّ اِلَّآ اَنْ یَّاْتِیْنَ بِفَاحِشَةٍ مُّبَیِّنَةٍ وَعَاشِرُوْهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِنْ کَرِهْتُمُوْهُنَّ فَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّیَجْعَلَ اللّٰهُ فِیْهِ خَیْرًا کَثِیْرًا۔ ترجمہ:- اے ایمان والو تم کو یہ بات حلال نہیں کہ عورتوں کے جبراً مالک ہوجاؤ اور ان کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے ان کو دیا ہے، اس میں کا کوئی حصہ وصول کرلو۔ مگر یہ کہ وہ عورتیں کوئی صریح ناشائستہ حرکت کریں اور ان کے ساتھ خوبی کے ساتھ گذران کیا کرو۔ اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے کہ تم ایک شیٔ کو ناپسند کرو۔ اور اللہ تعالیٰ اس میں بڑی منفعت رکھ دے "۔

یہ ہے اس کا ترجمہ، دیکھئے کہ قرآن میں اس رسم کو مٹایا گیا ہے یا نہیں اور کرہاً کی قید واقعی ہے احترازی نہیں کیونکہ عورتیں اس وراثت سے راضی کبھی نہ ہوتی تھیں اگر وہ راضی ہوں تب بھی حرہ کی مملوکیت جائز نہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے تو اس کی زبان سے اذن نکاح کہلوایا تھا تو یہ زبان سے کہلوانا بھی محض نام کرنے کو ہے تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ بے پوچھے نکاح کردیا۔ کیونکہ مسئلہ یہ ہے کہ بیوہ کا نکاح بدون زبان کے کہے۔ جائز نہیں ہوتا۔ طیب خاطر کا اس میں خیال نہیں کیا جاتا۔

زبردستی نکاح

اور بعض مرتبہ بے پوچھے ہی نکاح کردیتے ہیں۔ نانوتہ میں ایک بیوہ کا نکاح ہوا اور دیوبند رخصت ہوئی وہ راضی نہ ہوتی تھی تو اس کو جبراً برات کے ساتھ کردیا اور کہدیا کہ وہاں لے جاکر اس کو راضی کرلینا۔ اور یہاں ایک نکاح عدت میں

ہوا۔ جب میں نے پوچھا کہ کیا یہ واہیات کیا تو کہنے لگے کہ نکاح کی نیت سے نہیں کیا۔ ذرا باڑھ لگادی تاکہ کسی اور جگہ سے نکاح نہ کرسکے۔ مگر اس کم بخت نے بعد عدت کے پھر بھی نکاح نہیں کیا۔ اس پر لوگ شکایت کرتے ہیں کہ وبا آگئی ہے طاعون آگیا۔ جب لوگ اس طرح حلال کے پردے میں حرام کاری کریں تو طاعون کیوں نہ آئے۔ صاجبوا ع

ع از زنا افتد وبا اندر جہاں [1]

سو بعض لوگ تو زبان سے بھی نہیں کہلواتے اور بعض لوگ زبان سے گو کہلواتے ہیں مگر پھر بھی اس پر تو ظلم ہوا۔ چونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو مالک سمجھ کر کہلواتے ہیں دوسری خرابی اس میں یہ ہوئی کہ ماں باپ کو مالک نہیں سمجھتے حالانکہ خدا اور رسول کے بعد ماں باپ کا حق ہے اطاعت کا۔

(وعظ ایضاً صـ ۵۸)

۱۸ - مائیوں بٹھانے کی رسم ناجائز ہے

اپنی دلہن کو دیکھئے کہ سال بھر تک منہ پر ہاتھ رہتے ہیں۔ شادی کے زمانے میں تو کبھی وہ اپنے منہ سے پانی تک بھی مانگ بیٹھے تو چاروں طرف سے غل مچ جائے کہ ہے ہے کیسی بے حیائی کا زمانہ آگیا۔ بلکہ شادی کے پہلے ہی سے یہ مصیبتیں اس بے چاری پر آجاتی ہے۔ اول سخت قرنطینہ میں رکھی جاتی ہے جس کو آپ کی اصطلاح میں مایوں بیٹھنا کہتے ہیں ایک کوٹھری میں بند کردی جاتی ہے جہاں ہوا تک اس کو نہیں پہونچتی۔ سارے گھر سے بولنا بند ہوجاتا ہے اپنی ضروریات تک میں دوسرے کی محتاج ہوجاتی ہے۔ اپنے آپ پاخانہ پیشاب کو نہیں جاسکتی۔ یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ ان رسموں کی بدولت دنیا کی سزائیں بھگتیں۔ لیکن غضب یہ ہے کہ اس قرنطینہ میں نماز تک نہیں پڑھتی۔ کیونکہ اپنے منہ سے پانی مانگ نہیں سکتی۔ اور اوپر والیوں کو اپنی ہی نماز کی پرواہ نہیں۔ اس کی کیا خبر لیں۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ وہ نماز جو کہ مرتے وقت بھی معاف نہیں چنانچہ کتاب میں لکھا ہے کہ ایک شخص کشتی میں سوار ہو اور کشتی ٹوٹ جائے اور یہ شخص ڈوبنے لگے اور وقت نماز کا آگیا ہو تو اس شخص کے ذمے واجب ہے کہ اسی غوطہ کرانے کی حالت میں نماز کی نیت باندھ لے پھر چاہے بچے چاہے ڈوبے،

[1] زنا کی وجہ سے جہان میں وبا پھیلتی ہے۔

دیکھئے نماز کی یہ تاکید ہے مگر اس قرنطینہ میں قضا کی جاتی ہے کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ باوجود ان منکرات کے یہ رسمیں جائز ہو سکتی ہیں۔ حاشا و کلا۔ دین سے قطع نظر عقل کے بھی تو یہ بات خلاف ہے کہ اس کو آدمی سے حیوان بلکہ جماد بنا دیا جائے اس کا کھانا پینا بند کیا جاتا ہے محض اس لئے کہ اگر کم کھانے کی عادت نہ ہوگی تو سسرال میں کھاوے گی۔ پھر پاخانہ جاوے گی۔ جو قانون حیا کے خلاف ہے حتیٰ کہ بہت جگہ یہ دیکھا گیا ہے کہ فاقے کرتے کرتے لڑکیاں بیمار ہو گئیں لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔ جب دین کو کوئی چھوڑتا ہے تو عقل بھی سلب ہو جاتی ہے شادی کی تقریبات کو کہاں تک بیان کردوں۔ جس رسم کو چاہے دیکھ لیجئے وہ دین کے خلاف ہونے کے ساتھ عقل سے بھی خارج ثابت ہوگی (وعظ منازعۃ الہویٰ صہ ۶۲ دعوات عبدیت حصہ ہفتم)

۱۹- چالیسویں وغیرہ کا کھانا محض برادری کی خوشنودی کے لئے کیا جاتا ہے

برادری کا کھانا فقط اسی واسطے ہوتا ہے کہ یہ دیکھتے ہیں کہ فلانے نے کیا کیا کھلایا تھا۔ غمی میں دیکھئے کہ زبان سے تو یہ کہا جاتا ہے کہ ثواب کے لئے کھانا کھلاتے ہیں مگر امتحان یہ ہے کہ اگر اس شخص سے خلوت میں یہ کہا جائے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جس مصرف میں زیادہ ضرورت ہوتی ہے اس میں روپیہ دینے سے زیادہ ثواب ملتا ہے اور جن کی تم دعوت کرتے ہو یہ سب کھاتے پیتے غنی ہیں۔ تم یہ دعوت کا روپیہ فلاں مدرسہ میں فلاں مسجد میں دیدو۔ یا فلاں آبرودار غریب آدمی کو چپکے سے دیدو اور اس کا ثواب میت کو بخش دے تو اب دیکھئے اس شخص کے دل پر کیا گذرتی ہے یہی کہے گا کہ سبحان اللہ! روپیہ بھی خرچ ہوا اور کسی کو خبر بھی نہ ہوئی تو بتلائیے کہ یہ صاف ریا ہے کہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ سب دکھلاوے کے لئے کیا جاتا ہے۔ جب یہ حال ہے تو ثواب کہاں سے ہوگا۔ اور جب اس کو ثواب نہ ملا تو میت کو کیا بخشے گا۔ کیونکہ ثواب پہنچانے کا خلاصہ یہ ہے کہ تم نے ایک نیک کام کیا۔ اور جو ثواب اس کا تم کو ملا وہ تم نے کسی دوسرے کو بخشدیا۔ اور جب یہاں ہی صفر ہے تو وہاں کیا بخشو گے۔

لہ دیکھاوا

ایک حکایت

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آئی کہ رامپور کے ایک شخص کسی جھوٹے پیر سے مرید ہو گئے کچھ دنوں کے بعد کسی نے ان سے پوچھا۔ کہو پیر صاحب سے کیا فیض پہونچا۔ یہ تھے صاف آدمی کہا۔ جب پانی سفادہ ہی میں نہ ہو تو بدھنے میں کہاں سے آوے تو یہی صورت ہے ثواب ملنے کی۔ پہلے کرنے والے کو ملتا ہے پھر وہ دوسرے کو دیتا ہے تو جب اسی کو نہ ملا تو یہ کسی کو کیا دے گا گویا سارا روپیہ ضائع ہو گیا اور یہ تو سب دعوے ہی دعوے ہیں کہ ثواب کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ صرف برادری سے شرما کر کیا جاتا ہے۔ اور لوگ اس کا زبان سے اقرار بھی کرتے ہیں۔

ایک گوجر کا واقعہ

کیرانہ میں ایک گوجر بیمار تھا۔ اس کا لڑکا حکیم صاحب کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ حکیم جی اس مرتبہ تو کسی طرح میرے باپ کو اچھا ہی کردو مجھے اس بڈھے کے مرنے کا تو غم نہیں مگر آجکل چاول بہت گراں ہیں برادری کو کھانا کھلانا تو مشکل ہوگا وہ بیچارہ تو سیدھا تھا۔ اس نے سچی بات کہدی۔ ہم باوضع ہیں زبان سے ظاہر نہیں کرتے مگر دل میں سب کے یہی ہے۔ یہ تو کھلانے والوں کی حالت ہے باقی کھانے والے وہ تو پورے ہی بے حیا ہیں کہ ایسے غم میں بجائے ہمدردی کے اور الٹا اس پر بار ڈالتے ہیں

ایک رئیس زادہ کی حکایت

اسی باب میں ایک صاحب حکایت بیان کرتے تھے کہ ضلع بلند شہر میں ایک رئیس کا انتقال ہو گیا چالیسویں دن رسم ادا کرنے کو ان کے تمام عزیز و قریب دوست، احباب، ہاتھی گھوڑے لیکر جمع ہوئے رئیس زادے نے سب کی خاطر مدارات کی عمدہ عمدہ کھانے پکوائے۔ جب کھانے کا وقت آیا اور تمام دسترخوان پر جمع ہو گئے اور سب کے آگے کھانے چن دیئے گئے۔ رئیس زادے نے کھڑے ہو کر تقریر کی کہ صاحبو! کھانے سے پہلے میری ایک بات سن لیجئے۔ پھر کھانا شروع کیجئے گا۔ آپ کو معلوم ہے کہ آپ لوگ اس وقت کس لئے جمع ہوئے ہیں چونکہ مجھ پر ایک بڑا حادثہ گذرا ہے کہ میرے والد صاحب کا سایہ میرے سر پر سے اُٹھ گیا ہے اس لئے آپ لوگ میرے ساتھ ہمدردی کرنے کے لئے جمع ہوئے ہیں تو کیا ہمدردی اسی کا نام ہے کہ میں تو غم میں مبتلا ہوں اور اس کی وجہ سے نہ کھانے کا رہا نہ پینے کا۔ اور آپ لوگ آستینیں چڑھا کر عمدہ عمدہ کھانے کھانے بیٹھ گئے۔ تم کو شرم نہیں آتی۔ بس اب کھانا شروع کیجئے۔ مگر اب کون کھاتا۔ تمام شرفاء مجلس سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور ایک جگہ جمع ہو کر مشورہ کیا کہ واقعی یہ چالیسویں کی رسم

اٹھادینے کے قابل ہے۔ چنانچہ سب نے متفق ہوکر اس رائے پر دستخط کر دیئے اور وہ تمام کھانا غربا کو تقسیم کرادیا گیا۔

حاصلِ کلام

حقیقت میں اگر غور کرو تو یہ سارے کھانے جو برادری کو کھلائے جاتے ہیں اسی قسم کے ہیں جن سے کھلانے والوں کو بجز تکلیف کے اور کھانیوالوں کو بجز بے حیائی کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ ابھی لوگ مولویوں ہی کو بدنام کرتے ہیں کہ یہ ایصال ثواب سے منع کرتے ہیں۔ صاحبو! ایصال ثواب سے کوئی منع نہیں کرتا۔ البتہ بے ڈھنگے پن سے منع کیا جاتا ہے۔ دیکھو اگر کوئی قبلہ کی طرف پشت کرکے نماز پڑھے تو اس کو منع کریں گے یا نہیں اگر شریعت کے موافق عمل ہو تو پھر دیکھو کون منع کرتا ہے جس کی بڑی شرط یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ہو یعنی ثواب کی نیت سے کیا جائے (وعظ" الدین الخالص ص۵۴)

۲۰ - تبرکاتِ نبویؐ کی زیادت

(۱) تبرکات نبویؐ میں ایک تو وہی زیادتی کی جارہی ہے جو اور بدعات میں ہے کہ اس کو لوگوں نے عید بنا رکھا ہے اس باب میں اکثر لوگ یہاں تک کہ بعض طلبا بھی شک میں ہیں۔ یوں سمجھتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے جبہ نبویؐ کی زیارت باعث برکت ہے اگر کوئی صرف زیارت کی نیت سے جائے تو کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا۔ مجھ سے ایک طالب علم نے جن کا مکان جلال آباد میں ہے اور جبہ شریف کے مکان کے پاس ان کی دوکان ہے سوال کیا کہ میں دوکان پر بیٹھ کر جبہ کی زیارت کرلوں گا مگر میں نے اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ وہ مجمع بالکل میلوں، عرسوں کی طرح ہوتا ہے۔ تاریخ کی تعیین ہوتی ہے دعوت ہوتی ہے دور سے آدمی آتے ہیں عورتوں کا اجتماع بھی ہوتا ہے۔ ایسے لوگ جو نماز بھی نہیں پڑھتے۔ زیارت کو آتے ہیں حالانکہ زیارت جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کے برابر نہیں ہوسکتی۔ حدیث :- لَا تَتَّخِذُوْا قَبْرِیْ عِیْدًا (میری قبر پر عید کا سا ہجوم نہ لگاؤ) سے اس کی نفی ہوگئی کیونکہ جبہ شریف کی فضیلت قبر شریف کے برابر نہیں ہوسکتی۔ گو اس میں یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ مثل یوم ولادت وغیرہ کے اس میں بھی تبدل ہوگیا۔ اگرچہ عدم تبدل کا یقین بھی نہیں۔ مگر خیر جو بات دل میں نہیں اس کو زبان پر بھی نہ لانا چاہیئے مگر ایک دوسری بات مابہ الامتیاز یہاں بھی موجود ہے کہ اس وقت وہ ملبوس جسد اطہر سے

مماس (چھوڑا) نہیں اور قبر شریف کو شرف مماس حاصل ہے اسی لئے جبہ نبویؐ کو کسی نے عرش سے افضل نہیں کہا۔ پس جب قبر کا عید بنانا حرام ہے تو ملبوس شریف کو عید بنانا کس طرح جائز ہوگا۔

موئے مبارک

کہیں کہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے موئے مبارک اس وقت تک موجود ہیں عید بنانا ان کی بھی جائز نہیں کیونکہ اگرچہ بظاہر یہ خیال کرکے موئے مبارک جزوِ بدن ہے قبر سے افضل معلوم ہوتا ہے مگر قبر میں اتصال اور تماس کی ایسی فضیلت موجود ہے جو موئے مبارک کو بالفعل حاصل نہیں۔ اس لئے دونوں غیر مساوی ہوئے۔ موئے مبارک جز ہے مگر اب مماس نہیں اور قبر شریف جز نہیں مگر مماس (ملا ہوا) ہے تو دونوں برابر ہوئے اور ایک مساوی سے دوسرے مساوی کا حکم معلوم ہوسکتا ہے پس حدیث لاتتخذوا قبری عیداً سے موئے مبارک کو عید بنانا حرام ہوگیا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی غایت بلاغت ہے کہ آپؐ نے قبر کو ذکر میں اختیار فرمایا۔ جس سے ملبوس اور شعر وغیرہ سب کے احکام خود بخود معلوم ہوگئے علاوہ ازیں صحابہ اور سلف صالحین نے عید منانے کو کبھی اختیار نہیں کیا۔ حالانکہ ان کے پاس ہم سے زیادہ تبرکاتِ نبویہؐ موجود تھے اور ان کو ہم سے زیادہ ثواب کے کاموں میں سبقت تھی اگر یہ کوئی خیر ہوتی تو سلف میں اس کی کچھ تو اصل ہوتی اب صرف یہ سوال رہ گیا کہ صحابہ میں عید کی طرح اجتماع نہ تھا تو آخر تبرکات کے ساتھ ان کا برتاؤ کیسا تھا تو اس کے لئے میں نے چند احادیث ایک پرچہ پر لکھ لی ہیں کیونکہ ان کا بلفظہ یاد رکھنا دشوار تھا۔

تبرکاتِ نبویؐ کے سلسلہ میں حدیثیں

اس وقت ان کو نقل کئے دیتا ہوں۔ عن عثمان بن عبداللہ بن وھب قال ارسلنی اھلی الی ام سلمۃ بقدح من ماءٍ وکان اذا اصاب الانسان عین او شیءٌ بعث الیھا مخضبۃ لھا فاخرجت من شعر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وکانت تمسکہٗ فی جلجل من فضۃ فخضخضت لہٗ فشرب منہٗ قال فاطلعت فی الجلجل فرأیت شعرات حمراءَ۔ (رواہ البخاری) عثمان بن عبداللہ بن وہب سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ مجھے میرے گھر والوں نے حضرت ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس ایک پیالہ پانی کا دیکر بھیجا اور قاعدہ تھا کہ جب کسی انسان کو نظر وغیرہ کی تکلیف ہوتی تو حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے پاس پانی کا پیالہ بھیج دیتا۔ ان کے پاس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کچھ بال تھے جن کو انہوں نے

چاندی کی نلکی میں رکھ رکھا تھا۔ پانی میں ان بالوں کو ہلا دیا کرتی تھیں اور وہ پانی بیمار کو پلا دیا جاتا تھا۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے جو جھک کر نلکی کو دیکھا تو اس میں چند سُرخ بال تھے۔ اس حدیث سے معلوم ہوگیا کہ ایک صحابیہ کے پاس نلکی میں رکھے ہوئے تھے۔ جس کے ساتھ یہ برتاؤ کیا جاتا تھا کہ بیماروں کی شفا کے لئے اس کا غسالہ پلا دیا جاتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خضاب کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔ صحیح یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال پکنے لگے تھے۔ جس سے دیکھنے والوں کو خضاب کا شبہ ہوتا تھا۔ ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی خضاب نہیں کیا۔ کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کل سفید بال قریب ۲۰ کے تھے یا کچھ زائد۔

جُبّہ مبارک کا تذکرہ

عن اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما انہا اخرجت جبۃ طیالسیۃ کسروانیۃ لبنۃ دیباج وفرجیہا مکفوفین بالدیباج وقالت ھذہ جبۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کانت عند عائشۃ فلما قبضت قبضتہا۔ وکان النبی صلی اللہ علیہ وسلم یلبسہا فنحن نغسلہا للمرضی نستشفی بہا۔ (رواہ مسلم)

حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ انھوں نے ایک جبہ طیلسانی کسروی نکالا جس کے گریبان اور دونوں چاک پر ریشم کی سنجاف لگی ہوئی تھی اور کہا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جبہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تھا ان کی وفات کے بعد میں نے اسے لے لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کو پہنا کرتے تھے ہم اس کو پانی میں دھو کر وہ پانی بیماروں کو پلا دیتے ہیں شفا حاصل کرنے کے لئے۔

موئے مبارک سے متعلق حدیث

وعن انس قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اتی منی فاتی الجمرۃ فرماھا ثم اتی منزلہ بمنی ونحر نسکہ ثم دعا بالحلاق وناول الحالق شقہ الایمن فحلقہ ثم دعا اباطلحۃ الانصاری فاعطاہ ایاہ ثم ناول الشق الایسر فقال احلق فحلقہ فاعطاہ اباطلحۃ فقال اقسمہ بین الناس۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم حجۃ الوداع میں عرفات سے منیٰ میں تشریف لائے تو جمرہ عقبہ کے پاس پہنچے اور اس کی رمی کی پھر منیٰ میں جو مکان آپ کے لئے مقرر تھا اس میں تشریف لائے۔ اور قربانی کے جانوروں کو ذبح کیا۔ پھر حلاق (نائی) کو بلا لیا اور

اس کو سر کا داہنا حصہ اول دیا اس نے داہنے حصے کو مونڈا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطلحۃ انصاری رضی اللہ عنہ کو بلایا اور وہ بال ان کو عطا کئے پھر نائی کو سر کا بایاں حصہ دیا۔ اور فرمایا مونڈو اس نے بائیں حصہ کو بھی مونڈا آپ نے وہ بال بھی ابوطلحۃ انصاری رضؓ کو دیئے اور فرمایا کہ اس کو لوگوں میں تقسیم کرو۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت مقدار میں اپنے موئے مبارک صحابہ میں تقسیم فرمائے ہیں اور ظاہر ہے کہ صحابہ رضؓ شرقاً و غرباً منتشر ہوگئے تھے اور اگر کہیں موئے مبارک پایا جاوے تو جلدی سے اس کا انکار نہ کر دیا جائے بلکہ اگر سند صحیح سے اس کا پتہ معلوم ہو جائے تب تو اس کی تعظیم کی جائے ورنہ اگر یقینی دلیل افترا و اختراع کی نہ ہو تو سکوت کیا جائے یعنی نہ تصدیق کی جاوے نہ تکذیب۔ مشتبہ امر میں شریعت نے ہمیں یہی تعلیم دی ہے۔

لباس مبارک

وعن ام عطیۃ فی قصۃ غسل زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وتکفینہا انہا قالت فالقی حقوہ فقال اشعرنہا ایاہ فقال الشیخ فی اللمعات وھذا الحدیث اصل فی البرکۃ باثار الصالحین ولباسھم۔

حضرت ام عطیہ رضی اللہ عنہا حضرت زینب بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل و کفن کے واقعہ میں روایت کرتی ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا تہہ بند ہمارے پاس ڈال دیا کہ اس کو مرحومہ کے بدن سے مماس کر کے پہناؤ یعنی سب سے نیچے اس کو رکھو تا کہ اس کی برکت بدن سے متصل رہے۔ حضرت شیخ عبدالحق رحمہ اللہ لمعات شرح مشکوٰۃ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں کہ یہ حدیث آثار و ملبوسات صالحین سے برکت لینے میں اصل ہے معلوم ہوا کہ تبرکات سے برکت حاصل کرنیکا ایک یہ بھی طریقہ ہے کہ بعد موت کے اس کو کفن میں رکھ دیا جائے۔ مگر اس سے قرآن اور دعاؤں کی کتابوں کا کفن میں رکھنا جائز نہ ہوگا۔ کیونکہ اس میں ان کا احترام باطل ہو جاتا ہے کیونکہ قرآن کے ساتھ ناپاکی کا اتصال حرام ہے۔ اور بدن میت چند روز کے بعد پھولے پھٹے گا وہ نجاست قرآن کو بھی لگے گی۔ اسی طرح وہ کتابیں جن میں دعائیں اور اللہ رسول کا نام جا بجا ہے قابل احترام ہیں بلکہ الفاظ و حروف مطلقاً قابل احترام ہیں بلکہ سادہ کاغذ بھی بوجہ آلہ علم ہونے کے قابل احترام ہے۔ بعض لوگ فرعون و ہامان کا نام لکھ کر اس پر جوتے مارتے ہیں۔ یہ بالکل لغو و مہمل حرکت ہے اس پر تو بس نہ چلا۔ الفاظ کی ہی بے حرمتی پر بہادری دکھلائی مگر ان سب کے ساتھ ان کو عید نہ بنانا چاہیئے کیونکہ سمجھنے کی بات ہے کہ ان چیزوں کی قدر کس لئے ہے۔ اسی لئے

تاکہ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چیزیں ہیں پھر احکام بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی چیزیں ہیں۔ پھر احکام بھی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں ان کی بھی تو قدر کرنی چاہیئے ان میں بھی تو برکت ہے اس برکت کو بھی تو لینا چاہیئے۔ غرض وہ جو سوال کیا گیا تھا کہ سلف صالحین کا تبرکات کے ساتھ کیسا برتاؤ تھا۔ ان روایتوں سے اس کا جواب معلوم ہو گیا۔ انہی کے موافق ہم کو بھی عمل کرنا چاہیئے اس سے زیادہ تعدی نہ کرنا چاہیئے۔

تبرکات نبوی کیساتھ غلو

بعض لوگ یہاں تک غلو کرتے ہیں کہ جبہ شریفہ کے لئے نذریں مانتے ہیں۔ فقہاء نے اس کو حرام لکھا ہے۔ کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت مخلوق کے لئے نہیں ہو سکتی۔ عبادت خالق جل و علیٰ شانہ کے لئے خاص ہے۔ بحر الرائق میں اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ نذر ماننا مخلوق کے لئے سب کے نزدیک اتفاقاً حرام ہے نہ وہ نذر منعقد ہوگی اور نہ اس کا پورا کرنا ذمہ میں واجب ہوگا۔ اور وہ حرام بلکہ سخت حرام ہے مجاوروں کو اس کا کھانا لینا اور اس میں کسی قسم کا تصرف کرنا جائز نہیں۔ (وعظ الحبور ص۲۱)

تبرکات کام نہیں آتے۔

(ب) تبرکات کے بھروسہ پر کوئی نہ رہے۔ بدون ایمان کے سب بیکار ہیں چنانچہ دیکھ لو کہ ابن اُبی کے پاس کتنے تبرکات جمع ہو گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا قمیص مبارک اس کے کفن میں دیا۔ بھلا یہ بات کس کو نصیب ہوتی ہے آجکل کوئی بہت کریگا غلاف کعبہ کا ٹکڑا رکھدیگا۔ مگر غلافِ کعبہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قمیص سے کیا نسبت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جسد اطہر عرش و کعبہ سب سے افضل ہے اور اگر غلاف کعبہ کو قمیصِ نبوی ؐ کے برابر مان بھی لیا جاوے تو یہ دولت کس کو نصیب ہو سکتی ہے کہ حضور ؐ کا لعاب مبارک اس کے منہ میں پڑے۔ عبد اللہ بن ابی کے مرنے کے بعد آپ ؐ نے اپنا لعاب مبارک بھی اس کے منہ میں ڈال دیا تھا۔ وہ تو آپ ؐ کا جزو تھا جس کی برکت لباس سے بھی زیادہ ہے۔ پھر آپ ؐ نے اس کے جنازے کی نماز پڑھی گویا اس کے لئے دعا مغفرت فرمائی۔ بھلا یہ شرف آج کس کو نصیب ہو سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو لے کر اس کے جنازہ کی نماز پڑھیں مگر باوجود ان تمام باتوں کے عبد اللہ بن ابی کو ان تبرکات سے کچھ بھی نفع نہ ہوا کیونکہ وہ ایمان سے محروم تھا حق تعالیٰ صاف فرما دیا۔ انہم کفروا باللہ وبرسولہ وماتوا وھم ناسقون۔

(الرفع والوضع ص۳۰)

۲۱۔ رمضان شریف کے لئے نیک کاموں کا روکے رکھنا؟

بعض لوگ رمضان سے پہلے بعض نیک کاموں کو روکے رکھتے ہیں مثلاً کسی کی زکوٰۃ کا سال شعبان میں پورا ہو گیا اب وہ زکوٰۃ ادا نہیں کرتا رمضان کے انتظار میں روکے رکھتا ہے چاہے رمضان میں اس کو توفیق ہی نہ ہو۔ روپیہ چوری ہی ہو جائے یا رمضان کے انتظار میں محتاج کا قلیہ ہی ہو جائے یاد رکھو شارع کا اس ترغیب سے ہرگز یہ مطلب نہیں کہ رمضان کے انتظار میں نیک کاموں کو روکا جائے بلکہ شارع کا مقصود تاخیر عن رمضان سے روکنا ہے کہ اگر رمضان تک کسی کو توفیق نہ ہوئی ہو تو رمضان میں ہرگز دیر نہ کرے جو کرنا ہو کر ڈالے۔ تقدیم علیٰ رمضان سے روکنا مقصود نہیں۔ وشتان بینھما۔ (یعنی ان دونوں باتوں میں بڑا فرق ہے) مگر کم فہمی نے یہ نتیجہ پیدا کیا کہ لوگ رمضان میں خرچ کرنے کے لئے فضائل اور ثواب سن کر اس کے انتظار میں طاعات کو روکنے لگے خوب سمجھ لو کہ تعجیل فی الخیر میں خود بہت بڑا ثواب ہے اور وہ اتنا بڑا ثواب ہے کہ رمضان کے پہلے جو تم خرچ کر دوگے تو گو اس میں کماً بہ نسبت رمضان میں خرچ کرنے کے ثواب کم ہو مگر میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ کیفاً و تقرباً الی اللہ وہ تعجیل بہتر ہے اور اس درجہ میں اس کا ثواب رمضان کے ثواب سے بڑھ جائے گا۔ مجھے کوئی تو اطمینان ہے جو میں شرح صدر کے ساتھ اس مضمون کو بیان کر رہا ہوں۔ بس قسم سے زیادہ اطمینان دلانے کا ذریعہ میرے پاس کوئی نہیں تمہیں کیا خبر ہے کہ شعبان میں اگر تم کو غریب کو زکوٰۃ دیدیئے تو اس وقت اس کے دل سے کیسی دعا نکل جاتی ہیں جس کے سامنے شہر رمضان میں بھی ہیچ ہیں۔

نیکی میں تاخیر نہیں کرنا چاہیئے

یہی بات لوگوں کو معلوم نہیں یاد رکھو جب زکوٰۃ کا سال پورا ہو جائے اس کے بعد تاخیر کرنے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اس تاخیر سے گناہ ہوتا ہے یا نہیں۔ بعض وجوب علی الفور کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک تاخیر سے گناہ ہوتا ہے اور بعض وجوب علی التراخی کے قائل ہیں ان کے نزدیک گناہ نہیں ہوتا۔ بس احتیاط اسی میں ہے کہ وجوب کے بعد دیر نہ کرے تاکہ سب کے نزدیک گناہ سے محفوظ رہے۔ پھر اگر رمضان کے انتظار میں صدقات کا روکنا موجب ثواب ہوتا تو شریعت نے کہیں تو یہ کہدیا ہوتا کہ رمضان سے اتنے دن پہلے تمام صدقات کو روک دو۔ جب

شریعت نے کہیں یہ نہیں کہا تو اب ہمارا ایسا کرنا یہ زیادتی فی الدین اور بدعت ہے کہ جس کام کے لئے شریعت نے ثواب بیان نہیں کیا تم اس میں ثواب سمجھ کر کرتے ہو ۔ یہ مقاومت (مقابلہ) ہے حکم شرعی کی مگر چونکہ اب تک جہل میں مبتلا تھے علم نہیں تھا اس لئے اُمید ہے کہ گنہ گار نہیں ہوئے . . . . . ہوں گے ہاں اب جو لوگ ایسا کریں گے وہ گنہ گار ہوں گے ، کیونکہ اب مطلع صاف ہوگیا۔

(تقلیل المنام ص۳۰)

۲۲ - عید میلاد النبی کی دلائل اربعہ سے تردید

جاننا چاہیئے کہ عید میلاد النبی کے نام سے جو ایک رسم شائع ہوئی ہے اس کے متعلق دو کلام ہیں ایک تو اس کے نامشروع ہونے کے متعلق دلائل ۔ دوسرے مخالفین کے دلائل کا جواب اس کے بعد سمجھئے کہ شریعت کے دلائل چار ہیں ۔ کتاب[۱] ، سنت[۲] ، اجماع[۳] ، قیاس[۴] ۔ انشاء اللہ چاروں سے گفتگو کی جاوے گی ۔

میلاد کی تردید قرآن میں

اول کتاب اللہ کو لیجئے ۔ حق تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں ۔ اَم لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللهُ ۔ یعنی کیا ان کے شرکاء کے لئے ہیں کہ انھوں نے ان کے لئے دین کی وہ بات مقرر کر دی جس کی اللہ نے اجازت نہیں دی ۔" یہ آیت صاف بتلا رہی ہے کہ دین کی بات بدون اذن الٰہی یعنی بدون دلیل شرعی کسی کو مقرر کرنا مذموم[۱] و مستنکر[۲] ہے ۔ یہ تو کبریٰ ہے اور صغریٰ یہ ہے کہ عید میلاد النبی دین ہی کی بات سمجھ کر بلا دلیل مقرر کی گئی ہے اور دلیل نہ ہونا جزئیاً تو ظاہر ہے کہ یہ امر شریعت میں نہیں ہے ، امر مستحدث[۳] ہے ۔ اگر احتمال ہے تو اس کا ہے کہ کسی کلیہ میں داخل کرتے ہوں گے ۔ مفصل گفتگو تو ان کلیات کی جسمیں یہ داخل ہوسکتی ہے آگے آوے گی ۔ باقی مجملاً یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ سبب داعی اس کا قدیم ہے خواہ وہ فرح ہو یا اظہار شوکت اسلام ہو کہ وہ بھی قدیم ہے بہرحال ان میں سے جو بھی سبب ہو ۔ تو ہم یہ کہتے ہیں کہ جب کہ یہ سب حضور و صحابہؓ و خیر القرون کے زمانہ میں موجود تھا اور وہ حضرات قرآن و حدیث کو خوب سمجھنے والے تھے اور ایسا سمجھتے تھے کہ اس کو دیکھ کر اب اجتہاد کو جائز نہیں رکھا گیا ۔ پس جب مسلم ہو چکا کہ وہ کتاب و سنت کو ہم سے زیادہ سمجھنے والے تھے اور یہ اسباب بھی اس وقت موجود تھے ، یعنی اظہار فرح اور شوکت اسلام کی اس

---

۱ بُرا ۔ ۲ مکروہ ۔ ۳ نیا گڑھا ہوا ۔

وقت بھی ضرورت تھی بلکہ اِس وقت سے زیادہ ضرورت تھی مگر ان حضرات نے اس پر عمل نہیں کیا پس معلوم ہوا کہ کسی کلیہ میں اس کا داخل کرنا صحیح نہیں اور یہ امر بالکل مستحدث او رجدید ہے کہ جس کی کچھ اصل نہیں اور بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ غیر دین کو دین سمجھ کر کیا جائے اور اس کو یہ لوگ دین سمجھتے ہیں پس یہ بدعت واجب الترک ہیں یہ تو قرآن مجید سے اس کے متعلق کلام تھا ۔

میلاد کی تردید حدیث میں

اب حدیث لیجئے ۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں ۔ من احدث فی امرنا هذا ما ليس منه فهو رد یعنی جو شخص ہمارے اس دین میں وہ شئی نکالے جو اس میں سے نہیں ۔ پس وہ واجب الرد ہے ۔ جو تقریر آیت کے ذیل میں کی گئی ہے وہی یہاں بھی ہے ۔ اور مراد نئی شئی سے وہ ہے جس کا سبب قدیم اور پھر اس وقت معمول بہ نہ ہوئی ہو ۔ باقی سبب جدید ہو ۔ اور نیز وہ موقوف علیہ کسی مامور بہ کی ہو ۔ وہ مامنہ میں داخل ہو کر واجب ہے ۔ اور دوسری حدیث لیجئے ۔ مسلم کی روایت ہے ۔ قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تختصوا ليلة الجمعة بقيام من بين الليالي ولا تختصوا يوم الجمعة بصيام من بين الايام الا ان يكون في يوم يصومه احدكم یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شب جمعہ کو اور راتوں میں سے شب بیداری کے ساتھ خاص مت کرو اور یوم جمعہ کو ایام میں سے روزہ کے ساتھ خاص مت کرو مگر یہ کہ اس دن میں کوئی تم میں سے پہلے سے روزہ رکھتا ہو ۔ اس حدیث سے یہ قاعدہ کلیہ نکلا کہ جو تخصیص منقول نہ ہو وہ منہی عنہ ہے یہ دوسری بات ہے کہ جمعہ کے روز روزہ رکھنا کیسا ہے ہمارے علماء نے دوسری دلیل مستقل سے جواز کا حکم دیا ہے اور نہی کو عارضی کہا ہے اس وجہ سے کہ روزہ رکھ کر وظائف جمعہ سے ضعیف نہ ہو جائے یہ فرعی گفتگو ہے ۔ یہاں تو صرف اس قاعدہ کلیہ کا مستنبط کرنا مقصود ہے سو قاعدہ کی صحت میں مجوزین صوم جمعہ کو بھی کلام نہیں ہے غرض یہ قاعدہ کلیہ کو تخصیص غیر منقول دین کے اندر جائز نہیں صحیح ہے یہ تو کبریٰ ہے اب خاص یوم ولادت کی عید منانے کی تخصیص دیکھتے کہ یہ تخصیص کیسی ہے ظاہر ہے کہ منقول نہیں اور نہ تخصیص عادی ہے بلکہ اس کو دین کی بات سمجھتے ہیں چنانچہ اس کے تارک کو ملامت کرتے ہیں اور بد دین سمجھتے ہیں ۔ اگر تخصیص عادی ہوتی تو ملامت نہ کرتے اور نہ ان کو بد دین جانتے جیسے کسی کو عادت ململ پہننے کی ہو تو اس کے تارک کو ملامت نہیں کرتے ۔ بہرحال اس کو دین سمجھتے ہیں ۔ پس یہ تخصیص دین میں ہوئی اور غیر منقول

---

۱ جس سے روکا گیا ہو ۔

ہوئی۔ یہ صغریٰ ہوا اور کبریٰ اول آچکا ہے نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ تخصیص ناجائز ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو مقیس علیہ یعنی یوم جمعہ سے بھی بڑھ کر ہے اس لئے کہ یوم جمعہ کے فضائل تو احادیث میں صراحۃً بھی وارد ہیں اور یوم ولادت کی کوئی فضیلت صراحۃً وارد نہیں۔ گو قواعد سے فی نفسہ یوم ولادت میں برکت اور فضیلت کے کبھی مسلمان قائل ہیں ایسا کون ہوگا جو اس دن بلکہ اس ماہ کی برکت کے قائل نہ ہو۔ چنانچہ سیوطی یا ملا علی قاری اس ماہ کی فضیلت میں فرماتے ہیں ؎

هذا الشهر في الاسلام فضل ومنقبة تفوق على الشهور

ربيع في ربيع في ربيع ونور فوق نور فوق نور

اور میں اس پر اضافہ کر کے کہتا ہوں ؎

ظهور في ظهور في ظهور سرور في سرور في سرور

فضائل یوم ولادت کی صراحت نہیں

پس نفس برکت اور فضیلت کا انکار نہیں۔ گفتگو اس میں ہے کہ جیسے جمعہ کے فضائل تصریحاً وارد ہیں ایسے یوم ولادت کے نہیں پس جس کے فضائل منصوص نہ ہوں اس کی تخصیص کیسے ناجائز نہیں ہوگی بعض لوگوں نے دعویٰ کیا ہے کہ یوم ولادت کی فضیلت بھی حدیث میں آئی ہے۔ چنانچہ آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دوشنبہ کے روز روزہ رکھا کرتے تھے کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ آپ اس دن روزہ کیوں رکھتے ہیں فرمایا ولدت یوم الاثنین یعنی میں پیر کے دن پیدا ہوا ہوں۔ تو اس کا جواب انشاء اللہ مخالفین کے دلائل کے ذیل میں آئے گا۔

روضہ مبارک کی زیارت

اور تیسری حدیث سنیئے۔ نسائی نے روایت کیا ہے قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا تجعلوا قبري عيدا وصلوا علي فان صلوتكم تبلغني حيث كنتم۔

ترجمہ :- یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری قبر کو عید مت بناؤ۔ اور مجھ پر درود بھیجو۔ کیونکہ تمہارا درود میرے پاس پہنچے گا جہاں کہیں تم ہو گے۔ اس حدیث میں غیر عید کو عید بنانے کی بالتخصیص ممانعت ہے شاید اس میں کوئی شبہ کرے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر پر تو سب جمع ہوتے ہیں۔ جواب یہ ہے کہ عید میں جیسے جمع ہوتے ہیں اسی طرح میری قبر پر مت جمع ہو۔ اور عید میں اس طرح جمع ہوتے ہیں کہ اس کی تاریخ معین ہوتی ہے اور نیز اس میں تداعی یعنی اس کا اہتمام ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو وہاں جمع ہونے کے لئے بلاتا ہے پس اس طرح جمع ہونیکی

ممانعت ہے اور اتفاقی اجتماع سے ممانعت نہیں ہے چنانچہ روضۂ اقدس کی زیارت کے لئے جو جاتے ہیں تو اس میں یہ دونوں امر نہیں ہیں اس کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں ہے بلکہ آگے پیچھے کیف ما اتفق قافلے جاتے ہیں اور زیارت کر کے چلے آتے ہیں اور نہ کچھ اہتمام ہے کہ سب کا اجتماع ضروری سمجھا جاتا ہو بہر حال اس حدیث سے صراحۃً ثابت ہوتا ہے کہ قبر شریف پر بطور عید کے جمع ہونا ناجائز ہے پس جس طرح عید مکانی ممنوع عنہ ہے اسی طرح عید زمانی بھی منہی عنہ ہوگی۔ اب رہ گئی یہ بات کہ اس کے بعد صلوا علی فان صلاتکم تبلغنی حیث کنتم۔ بڑھانے سے تو اجتماع کا عدم جواز بھی مفہوم ہوتا ہے جیسا علت فان صلاتکم ظاہراً اس پر دال ہے سو شراح نے مختلف توجیہات اس کی کی ہیں میرے ذہن میں سب سے اقرب توجیہ اس کی یہ آتی ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ اس نہی لا تجعلوا میں اہل بدعات یہ عذر کر سکتے تھے کہ ہم تو صلوٰۃ یعنی درود شریف پڑھنے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے روضۂ اقدس پر جمع ہوتے ہیں اور صلوٰۃ مامور بہ ہے تو ہمارا اجتماع جائز ہوگا۔ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس شبہ کا جواب دیتے ہیں اور اس احتمال کا استیصال فرماتے ہیں کہ درود شریف یہاں آنے پر موقوف نہیں ہے جہاں کہیں تم ہوگے درود شریف میرے پاس پہنچتا ہے اس لئے یہ عذر غیر موجہ ہے اور اس سے ایک بہت بڑی بات مستنبط ہوتی ہے کہ صلوٰۃ جس کے بعض افراد مندوب اور بعض واجب اور بعض فرض ہیں جب اس کے لئے عید کے طرز پر جمع ہونا جائز نہیں تو کسی اور غرض مخترع کے لئے جمع ہونا تو کیسے جائز ہوگا لیکن اس سے کوئی یہ شبہ نہ کرے کہ خود زیارت کے لئے جانا بھی جائز نہیں، اس لئے کہ وہاں جو جاتے ہیں تو مقصود اصلی صلوٰۃ نہیں ہے بلکہ زیارت مقصود ہے اور وہ بدون قبر ہر جگہ ممکن نہیں۔

چوتھی حدیث سے استدلال

چوتھی حدیث یہ ہے کہ عید کے روز کچھ لڑکیاں کھیل رہی تھیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف رکھتے تھے حضرت عمر رضی اللہ عنہ تشریف لائے انہوں نے لڑکیوں کو ڈانٹا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ ان لکل قوم عيدا و هذا عيدنا یعنی اے عمر منع ۔ ۔ ۔ نہ کرو ہر قوم کی ایک عید ہوتی ہے اور یہ ہماری عید ہے۔ اس حدیث میں علت ان کے کھیلنے کی اباحت کی یہ فرمائی کہ یہ ہماری عید ہے۔ اس میں جواز لعب کو یوم عید ہونے سے معلل فرمایا گیا جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ عید کے ساتھ خاص ہے سو اگر ہر شخص کو عید منانا جائز ہو تو ہر روز ایسا لعب جائز ہو جاویگا

لہ جس سے روکا گیا ہو۔

اور تخصیص منصوص باطل ہوجاوے گی جس سے مخترع کی ثابت ہوئی۔

عدم جواز پر اجماع سے ثبوت

اب رہا اجماع سو اس سے بھی ثابت ہے۔ تقریر اس کی یہ ہے کہ قاعدہ اصولیہ ہے کہ تمام امت کا کسی امر کے ترک پر متفق ہوجانا یہ اجماع ہوتا ہے اس کے عدم جواز پر۔ چنانچہ فقہاء نے جابجا اس کے قاعدے سے استدلال کیا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی فعل کو ہمیشہ ترک کرنے سے استدلال کرتے تھے۔ مثلاً فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے عید کی نماز پڑھی لیکن اس میں اذان اور تکبیر نہیں تھی اسی طرح جس شئے کو تمام امت نے ترک کردیا ہو وہ واجب الترک ہے اسی بنا پر فقہاء نے صلوٰۃ عیدین میں بلا اذان و تکبیر کہا ہے۔ پس اگر یہ قاعدہ مسلم نہ ہوتا تو آج سے ہی عیدین میں اذان اور تکبیر کا بھی اضافہ کردینا چاہیئے۔ اور اگر مسلّم ہے تو اس قاعدے سے اور جگہ بھی کام لو۔

ایک شبہ کا جواب

اس پر ایک شبہ ہو سکتا ہے کہ تمام امت نے عید میلاد النبی کو ترک نہیں کیا اس لئے کہ امتی تو آخر ہم بھی ہیں سو ہم اس کو کرتے ہیں پس اجماع کہاں رہا۔ جواب اس کا یہ ہے کہ اصول فقہ کا قاعدہ مسلّمہ ہے کہ اختلاف متاخر اتفاقِ متقدم کا رافع نہیں ہے یعنی جس امر پر تمام امت کا اتفاق زمان سابق میں متحقق ہوچکا ہو اب اس اتفاق کو بعد کا اختلاف نہ اٹھاویگا پس جب تک تم لوگوں نے ایجاد نہیں کیا تھا اس وقت تک تو امت کا اس کے ترک پر اتفاق تھا اب وہ اتفاق مرتفع نہیں ہو سکتا۔ اس قاعدہ کی ایک جزئی اور ہے کہ علماء حنفیہ نے نماز جنازہ کا تکرار جائز نہیں رکھا اور دلیل یہی لکھی ہے کہ صحابہؓ اور تابعین سے ثابت نہیں۔ غرض یہ قاعدہ مسلّم ہے کہ امت کا کسی امر کو ترک کرنا اس کے عدم جواز کی دلیل ہے پس بفضلہ تعالیٰ اجماع امت سے بھی ثابت ہوگیا کہ یہ عید بدعت اور امر مخترع واجب الترک ہے۔

عید میلاد کا عدم جواز قیاس سے

اب رہا قیاس تو قیاس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ قیاس جو مجتہد سے منقول ہو، اور ایک وہ جو مجتہد سے منقول نہیں اور یہ قاعدہ کہ غیر مجتہد کا قیاس معتبر نہیں ہے ان واقعات میں ہے کہ جو مجتہدین کے زمانہ میں پائے گئے ہیں اور جو نئے واقعات پیش آویں ان میں قیاس غیر مجتہد کا معتبر ہے چنانچہ جس قدر نئی تجارتیں اور ایجادات اس زمانے میں ہوئی ہیں سب کا حکم قیاس سے ہی ثابت ہوتا ہے۔ مع ہذا ہم خود قیاس نہیں کرتے اس لئے کہ ہم کو قیاس کرنے کی ضرورت تو جب تھی جب کہ سلف کے کلام میں اس سے تعرض نہ ہوتا۔ اس لئے کہ ان حضرات کا قیاس ہمارے قیاس سے مقدم ہے اور ان کے

کلام میں اس سے تعرض ہے، چنانچہ تبعید الشیطان و صراط مستقیم میں بہت زور و شور سے اس امر پر گفتگو کی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ کسی زمانہ یا مکان کو عید بنانا ممنوع ہے پس قیاس سے بھی اس عید کا ناجائز ہونا ثابت ہوا تو ہمارے دلائل تھے۔

موجدین کے دلائل اور ان کا جواب

اب موجدین عید کے دلائل کی تقریر اور ان کا جواب سنیئے۔ اور انکی طرف نسبت دلائل کی میں نے اس احتمال سے کردی ہے کہ شاید ان میں سے کبھی کوئی ان سے استدلال کرنے لگے ورنہ میں نے یہ دلائل ان سے منقول نہیں دیکھے بلکہ وہ تو اگر برسوں بھی کوشش کریں تو ان کو ایک دلیل بھی میسر نہ ہو اسی واسطے جی تو نہیں چاہتا تھا کہ ان کو دلائل دیئے جاویں لیکن صرف اس وجہ سے کہ کسی کو کوئی گنجائش نہ رہے اس لئے میں ان دلائل کو بھی مع جواب نقل کئے دیتا ہوں۔

پہلا استدلال اور اس کا جواب

اول آیت وہ ہے۔ قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذالك فليفرحوا۔ سے استدلال کرسکتے ہیں کہ اس آیت سے فرحت کا مامور بہ ہونا ثابت ہوا اور یہ عید بھی اظہار فرحت ہے۔ لہذا جائز ہے۔ جواب ظاہر ہے کہ اس آیت سے فقط فرحت کا مامور بہ ہونا نکلا۔ اور گفتگو اس ہیئت خاص میں ہے لہذا اس آیت سے اس کو کوئی مس نہیں اور اگر اس کلیہ میں اس کا داخل کرنا صحیح ہو تو فقہاء کے کتب فقہ میں جن بدعات کو روکا ہے وہ بھی کسی نہ کسی ایسے ہی کلیہ میں داخل ہوسکتی ہیں چاہیئے کہ وہ بھی جائز ہوجاویں حالانکہ کتب فقہ جو مسلم عند الفریقین ہیں ان میں ان کی ممانعت مصرحاً مذکور ہے اور ان اہل زیغ کو ہمیشہ یہ دھوکہ ہوتا ہے اور یا تجاہل ہے کہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اور اہل حق کے قضیہ کا موضوع ایک ہی ہے اسی بناء پر اہل حق پر اعتراض کردیتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی مغالطہ ہے۔ ہم جس بات کو ناجائز کہتے ہیں وہ ہیئت خاصہ ہے اور جو فرحت آیت "فليفرحوا"، سے ثابت ہوتی ہے وہ فرحت مطلقہ ہے۔ پس یہ یوں سمجھتے ہیں کہ یہ لوگ فرحت کو منع کرتے ہیں حالانکہ یہ صحیح نہیں۔ بلکہ اگر غور سے کام لیا جاوے تو ہم اس فرحت پر زیادہ عمل کرتے ہیں۔ اس لئے کہ یہ موجدین تو سال بھر میں ایک مرتبہ خوش ہوتے ہیں اور درمیان میں ان کی فرحت منقطع ہوجاتی ہے اور ہم ہر وقت خوش ہیں (اس لئے کہ اہل نسبت ایمان کی بشاشت اور اس کے ذوق سے ہر وقت مخمور رہتے ہیں) اور اہل حق میں ہی بہت سے افراد اس دولت سے مشرف ہیں۔ وَذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَاءُ وهذا هو الفرح المامور به، كما مر في تفسير الآية (جامع)، پس جو فرح کو منقطع کردیں وہ آیت کے تارک ہیں ہم تو کسی وقت بھی